جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر



بانی

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر

سید احمد خضر شاہ مسعودی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: محدثِ عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

اکتوبر ۲۰۲۵	جلد ۲۳	شمارہ: ۳	سلسلہ نمبر ۲۰۰

بانی: فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر: سید احمد خضر شاہ مسعودی

نائب مدیر

مولانا سید فضیل احمد ناصری

08881347125

نگراں ترسیل

مولانا ابوطلحہ اعظمی

09997504588

اشتراک وتعاون

اندرون ملک:

فی شمارہ -/30 سالانہ -/360

خصوصی -/1000

تاحیات -/6000

بیرون ملک:

سالانہ:20 امریکی ڈالر

خصوصی:100 امریکی ڈالر

تاحیات:500 امریکی ڈالر

شائع کردہ: جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)

فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371

موبائل (مدیر): 08006075484 ای میل: ahmadanzarshah@gmail.com

ورق درورق

صریرخامہ

عصریات

سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

لیجیے! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ 6/ اکتوبر کو بہار قانون ساز اسمبلی کے عام انتخابات کا اعلان الیکشن کمیشن نے کر دیا۔ کمیشن کے مطابق یہ انتخابات دو مرحلوں میں ہوں گے۔ پہلے مرحلے کی ووٹنگ 6/ نومبر کو ہوگی، جب کہ دوسرے مرحلے کے لیے 11/ نومبر کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ نتائج کا اعلان 14/ نومبر کو ہوگا۔ 8/ اسمبلی حلقوں کے لیے ضمنی انتخابات کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ 243/ ارکان پر مشتمل بہار اسمبلی کی مدت 22/ نومبر کو ختم ہو رہی ہے۔

الیکشن کمیشن کے اعلان کے ساتھ ہی سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ مثالی ضابطۂ اخلاق بھی لگے ہاتھوں نافذ ہو گیا۔ تمام پارٹیاں جیت کے لیے کمر بستہ ہیں۔ ہر مرحلے کے لیے امیدواروں کی نام زدگی ہو چکی۔ این ڈی اے ایک بار پھر اقتدار کی خواہاں ہے۔ عظیم اتحاد شکستوں کے سلسلے توڑنے کا خواہش مند۔ نتیش کمار سے مسند چھیننے کے لیے بے تاب و بے قرار۔ کانگریس کی فہرست میں مسلم امیدوار صرف چار ہیں۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ راہل گاندھی کی قیادت والی کانگریس نے تجربہ کاروں اور نوجوان امیدواروں کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ ادھر آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین بھی خم ٹھوک کر میدان میں ہے۔ اس نے 100/ نشستوں پر امیدوار اتارے۔ اس عجوبہ فیصلے سے عظیم اتحاد میں ناراضگی تو ہے ہی، مسلم حلقوں میں بھی تشویش کی لہر ہے۔ اہل اسلام اس پیش رفت کو اپنے لیے مضر باور کر رہے ہیں۔

بہار اسمبلی انتخابات پر پورے ملک کی نظر ہے، کیونکہ اس کے نتائج ہندوستان کا نیا سیاسی رخ طے کریں گے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر تمام پارٹیاں گوش و ہوش کے ساتھ تمام چالیں چل رہی ہیں۔ شہہ اور مات کا کھیل بہ خوبی جاری ہے۔ دماغی زور، ذہنی قوت، فکری توانائی، جسمانی کوشش پیہم بروئے کار۔ ان انتخابات کی تیاری عرصۂ دراز سے چل رہی تھی۔ سیاسی جماعتیں زمین ہموار کرنے اور ووٹ کی فصل اگانے

کے لیے مہینوں سے وہاں دوڑ رہی ہیں۔اس دوران متعدد ناخوشگوار واقعات پیش آئے، جن سے ساکنان ہند نئے تجربات وانکشافات سے گزرے۔راہل گاندھی نے جرأت مندانہ اور مبنی برصداقت بیانات اور بے باکانہ اقدامات سے زعفرانیوں کی نینداڑادی تھی۔الیکشن کمیشن پر جانب داری کا الزام لگا۔بھاجپا کوتو واضح الفاظ میں ووٹ چور کہا۔مسٹر گاندھی نے بانگ دہل کہا کہ حکمراں محاذ نے جو بھی کامیابیاں سمیٹیں، اس کی جہاں بھی حکومت بنی، جتنی حکومت بنی، ہر جگہ ووٹ چوری کا خصوصی دخل تھا۔ووٹ چور گدی چھوڑ کا نعرہ بھی پوری قوت کے ساتھ بلند ہوا۔ انتخابی فہرست پر خصوصی نظر ثانی (sir) بھی کافی چرچے میں رہی۔وجہ صاف تھی کہ آٹھ کروڑ رائے دہندگان کا مستقبل داؤ پر لگا تھا۔ان کی شہریت شک کے گھیرے گڑھے میں پھنسی تھی۔سرکاری دستاویزات کی تکمیل کے بعد سات کروڑ 42 لاکھ لوگ ہی حق رائے دہی کے اہل قرار پائے اور 58 / لاکھ افراد بیک بینی ودوگوش اس سے خارج کر دیے گئے۔اس پر کافی ہنگامہ بھی ہوا۔سڑکوں سے لے کر ایوانوں تک۔الیکشن کمیشن متنازع بنا دیا گیا۔رائے دہندگان کی فہرست تعجب خیز، بلکہ یاس انگیز۔ان میں کچھ وہ تھے جنہیں مردہ قرار دے دیا گیا، حالانکہ وہ دوڑ بھاگ رہے ہیں۔کچھ وہ تھے جو آں جہانی ہو چکے، مگر انہیں زندوں کے خانے میں ڈال دیا گیا۔اور تو اور، امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی بھی ووٹر آئی ڈی بن گئی، بلکہ مزید ترقی کرتے ہوئے جانور بھی ووٹ دینے کے حق دار ٹھہرے۔

امتحان اب اہل بہار کا ہے۔وہ اپنے ووٹوں کا استعمال بہ خوبی جانتے ہیں۔انہیں پتہ ہے کہ اس وقت ایک ایک ووٹ کی کیا قیمت اور کیا اہمیت ہے۔اہل بہار! ہوشیار باش!

❁ .... ❁ .... ❁

ایں چہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بہ خواب!

دیکھیے یہ انہونی بھی ہو گئی۔امارت اسلامیہ افغانستان کے وزیر خارجہ مولانا امیر خان متقی ہندوستان کے دورے پر آئے۔وہ بھی حکومت ہند کی خصوصی دعوت پر۔9 / اکتوبر سے 16 اکتوبر تک ملک کے مختلف حصوں میں ان کا دورہ جاری رہا۔11 / اکتوبر کو اپنی خواہش پر وہ دیوبند بھی آئے۔دیوبند کا نام آتے ہی سنگھی میڈیا میں کھلبلی مچ گئی۔نفرت کا عفریت دانۂ اسپند کی طرح اچھل کود کرنے لگا۔ان کا دورۂ دیوبند رد کرنے کی انتھک کوشش کی گئی۔دہلی سے بذریعۂ کار دیوبند کا سفر ہوا۔انٹیلیجنس کے افسران ساتھ ساتھ تھے۔حکومت کی طرف سے بڑے انتظامات کیے گئے تھے۔انہیں پولیس کی طرف سے استقبالیہ بھی دیا گیا۔عوام، علما اور طلبہ کا جم غفیر انہیں دیکھنے، ان سے ملنے اور ان کے بیان سے مستفید ہونے کے لیے امڈ

پڑا۔ بھیڑ کا یہ عالم کہ سرکاری انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا جلسۂ عام، جو دارالعلوم کی شیخ الہند لائبریری میں ہونا تھا، منسوخ کرنا پڑا۔ وزیر خارجہ دیوبند سے خوشگوار یادیں اور دلوں کو ٹھنڈک پہونچانے والے تجربات و مشاہدات کے ساتھ دہلی واپس لوٹ گئے۔ یہ دورہ ان کے لیے یادگار رہا۔ دیوبند کا اجلاس عام منسوخ تو ہوا ہی تھا، تاج محل کا دورہ بھی تنسیخ کی نذر ہوگیا۔ وزیر خارجہ ایک عالم دین، اسم بامسمی۔ اسلام کے حقیقی ترجمان۔ اپنے عالمانہ وقار اور شناخت کو باقی رکھتے ہوئے اپنے ملک کے لیے انھوں نے زبردست سفارت کی۔ وہ ہندوستان آئے تو ملکی میڈیا کے چہرے اڑے ہوئے تھے۔ اس کی شادابی و رعنائی ہرن ہو چکی تھی۔ اب کیا تاویل کرتا! عوام نے بھی موقع پا کر جم کر لتاڑا۔ خوب سنایا۔ یہی وہ میڈیا تھا جو طالبان کو دہشت گرد کے روپ میں پیش کرتا تھا۔ ان کی نفرت اس قدر تھی کہ اگر کوئی ان کی تعریف کرتا یا ان کا نام لے لیتا تو اس کی ہوٹنگ کی جاتی۔ اسے غدار وطن قرار دیا جاتا۔ اس پر مقدمہ ہوتا۔ اس کا عرصۂ حیات تنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی۔ اب سر بدل چکا تھا۔ وہی میڈیا سر عام طالبان کی تعریف کر رہا تھا۔ ان کی خوبیاں بنا رہا تھا۔ ان کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ افغانستان اور ہندوستان کے تعلقات یوں تو پہلے بھی رہے، مگر طالبان حکومت کے ساتھ پہلی بار قائم ہوئے۔ دہلی سے قربت اتنی بڑھی کہ دہلی میں اس نے سفارت خانہ کھول دیا۔ ہندوستان نے بھی کابل میں ایمبیسی قائم کر دی۔ 30/خوب صورت اور گراں قدر طبی ایمبولنس افغانستان کو تحفے میں دیں۔ قرآن کا یہ اعلان تازہ کر لیجیے: تلك الايام نداولها بين الناس۔

افغان وزیر خارجہ کا رویہ اس پورے دورے میں شاندار رہا۔ ٹوٹی پھوٹی اردو، مگر گفتگو پر اعتماد۔ مشاق سیاست کا اظہار۔ اسلامی تشخص برقرار۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جسے ان کی کمزوری پر محمول کیا جا سکے۔ ان کے تمام افکار، جملہ خیالات، میڈیائی بیانات، نپے تلے اور دل کو چھو جانے والے تھے۔ ابھی تک تو جو کچھ تھا، سب بہتر تھا۔ آگے کیا ہوگا؟ علیم و خبیر ہی اس کو خوب جانتا ہے۔

❁ .... ❁ .... ❁

13/اکتوبر 2025 کو غزہ اور اسرائیل جنگ بندی کی خبر ایک بار اور نشر ہوئی۔ عالمی میڈیا نے اس پر راحت کی سانس لی۔ اس جنگ بندی کے محرک امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ ہیں، وہی ٹرمپ، جو نوبیل انعام کے لیے گھلے اور مرے جا رہے ہیں۔ ٹرمپ نے جنگ بندی کا اعلان مصر میں کیا۔ اس اہم پروگرام میں اسرائیلی وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو کی بھی شرکت تھی۔ آدم خور و انسانیت دشمن۔ جنگ بندی کی تائید

اس نے بھی کی، مگر معنی خیز طریقے پر۔یعنی وہ جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔7/ اکتوبر 2023 کو اس لڑائی کا آغاز ہوا تھا۔اس کے بعد سے اسلحہ کی برسات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ دو سال ہو گئے۔اسرائیل نے سیکڑوں جانیں کھوئیں تو غزہ نے نصف لاکھ عزیزوں کو قبروں میں اتارا۔موت کا ہر روز رقص۔ایک جنازہ دفنایا جا رہا تھا تو دس جنازے مزید تیار۔زخمیوں اور معذروں کی تو کوئی گنتی ہی نہیں۔میزائل اتنے گرے۔ بم اتنے برسے۔دھماکے اتنے ہوئے کہ پورا شہر میدان بن گیا۔عمارتیں کھنڈرات۔جنگ بندی کی کوششیں بار بار ہوئیں۔دونوں طرف کے یرغمال رہا ہوتے رہے۔ایسا لگا کہ جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔پھر اچانک وہی شعلے، وہی مرغولے۔اسرائیلی بربریت کا عالم یہ ہے کہ قتل وغارت گری تو پھیلائی ہی، ان کا آب ودانہ بھی بند کر دیا۔لوگ فاقوں سے مرنے لگے۔جسم نیم جان ہو گئے۔پیاس سے تڑپنے اور بھوک سے گرنے لگے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ گلوبل فلوٹیلا سمندری راستے سے ان کی مدد کو پہونچا تو اسے بھی تشدد کا نشانہ بنایا۔اس کے ارکان کو پکڑ کر پابند سلاسل کر دیا گیا۔خدا خدا کر کے جنگ بندی ہوئی بھی تو اپنی فطرت سے مجبور ظالم اسرائیل نے گیارہ افراد کو پھر شہید کر ڈالا، جن میں 8/ بچے اور 3/ خواتین تھیں۔اس غاصب ریاست کا علاج اسلامی ممالک کر سکتے تھے، افسوس کہ وہ ممالک خود ہی بستر مرگ پر ہیں۔

فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین۔

مقامِ نبوت

علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ

''نبوت'' کی اصلی حقیقت تو اسی رب العزت قدوس وسبوح جل ذکرہٗ کو معلوم ہے جس نے نظامِ عالم کی ظاہری وباطنی اصلاح کے لیے اس ربانی عطیہ کی سنت عالم میں جاری کردی تھی، یا پھر اس کو جو اس عطیۂ الٰہی سے سرفراز کیا گیا ہو، کسی اور پر اس کی پوری حقیقت کا روشن ہونا حقیقت سے بعید ہے، اس لیے کہ انسان کے پاس حقائقِ اشیاء کے معلوم کرنے کے لیے عقل ہے اور ''نبوت'' ایک ایسی حقیقت ہے جو عقل سے وراء الوراء ہے۔ عقل وعقلیات کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے ''نبوت'' کی سرحد شروع ہوتی ہے، لیکن محققینِ اسلام اور اکابرِ امت نے قرآن کریم کی روشنی میں اور امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی مقدس زندگی کے آثار واحوال کے مشاہدہ وعلم کے بعد جو تحقیقات پیش کی ہیں وہ یقیناً ایک حد تک اس حقیقتِ کبریٰ کی جلوہ نمائی کے لیے کافی ہیں اور ان کی عقولِ سلیمہ نے اس حقیقت کی تفہیم میں جو عقلی پیرائے اختیار کیے ہیں اور نظائر وشواہد سے اس کو سمجھایا ہے وہ ہمارے ''علم کلام'' کا اہم ترین جزء ہیں۔ امام ابوالحسن اشعری، ابن حزم ظاہری، قاضی ابوبکر باقلانی، ابواسحاق اسفرائینی، ابویعلی، ابوالمعالی، امام الحرمین، عبدالکریم شہرستانی، امام غزالی، فخرالدین رازی، سیف الدین آمدی، ابن خلدون، عزالدین بن عبدالسلام، ابن تیمیہ وغیرہ وغیرہ، محققین اسلام نے تیسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر آٹھویں صدی کے وسط تک اس موضوع پر گرانبہا علمی جواہرات کا ایک نادر ترین ذخیرہ چھوڑا ہے۔(۱)

محققینِ ہند اور متاخرین علماء اسلام میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی دیوبندیؒ کے اسمائے گرامی اس سلسلہ کی صف اول میں درج ہونے چاہئیں، اور سچ تو یہ ہے کہ اس موضوع پر جو جواہر پارے شاہِ دہلیؒ نے پیش کیے ہیں، اس کی ہمسری کرنے کے لیے قدماء میں سوائے حجۃ الاسلام

---

(۱) بعض قدماء معتزلہ اور قدماء شیعہ کی بھی اس موضوع پر مستقل تصانیف ہیں، چونکہ جمہور اُمتِ محمدیہ کے مسلک کے وہ خلاف ہیں اور زیادہ تر ان کا طرز اس موضوع میں محض فلسفیانہ ہے، اس لیے ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

غزالیؒ کوئی دوسری ہستی زیادہ نمایاں نظر نہیں آتی یا تو یہ واقعہ ہے یا ہماری نظر کا قصور ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک ہزار برس کی تحقیقات کا عطر اُن کے سامنے موجود تھا اور ان کی تحقیقات کی تیز شعاعوں میں منزل مقصود کی رہنمائی آسان ہوگئی۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے حقائق کی تفہیم وافہام کے لیے جس سرچشمہ کی ضرورت تھی شاہِ دہلی خود اس سے سرشار تھے۔ امام غزالیؒ کی کتابوں میں یہ بحث ''المنقذ من الضلال'' و''معارج القدس'' میں سب سے عمدہ شکل میں موجود ہے۔ امام رازیؒ کی ''تفسیر کبیر'' و''مطالب عالیہ'' میں کافی سامان ہے۔ شاہِ دہلیؒ نے چند کتابوں میں اس کی پوری تحلیل اور کامل تجزیہ کیا ہے، بالخصوص اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی پہلی جلد کے مختلف ابواب میں نبوت کی حقیقت، منصبِ نبوت کی تشریح، نبوت کے خواص ولوازم، انبیاء ومصلحین کے فروق وغیرہ کو خوب واضح کیا ہے۔ (۱)

امیر یمانیؒ کی ''إیثار الحق علی الخلق'' میں اس موضوع میں کافی لمبی بحث موجود ہے۔ ابن تیمیہؒ کی اس موضوع پر ''کتاب النبوات'' تقریباً تین سو صفحات میں موجود ہے، لیکن حق یہ ہے کہ ابن تیمیہؒ نے باوجود علمی تبحر وتدقیق اور باوجود جلیل القدر محقق ہونے کے اس موضوع کا حق نہیں ادا کیا۔ غزالیؒ کے چند صفحے اور شاہِ دہلیؒ کے چند ورق کو میں اس ساری کتاب پر ترجیح دیتا ہوں، چند ضمنی فوائد ونکات کے سوا اس میں کوئی اہم بات یا علمی تحقیق اس موضوع پر نہیں جس کی ان سے توقع تھی۔ مجھے اس وقت نبوت کی عقلی تشریح کرنی منظور نہیں، کیونکہ اس کی تشریح سے پہلے ''روح'' کی حقیقت سمجھانی ہوگی جو بجائے خود ایک مستقل دقیق وغامض علمی مضمون ہے، جس میں ارسطو نے ''کتاب النفس'' لکھی ہے اور اس کی تلخیص وتراجم وشروح ثامسطیوس، لامقیدوروس، استیلقوس، اسکندر افرودوسی، ابن بطریق وغیرہ وغیرہ نے کی ہیں۔ (۲)

اسلامی دور میں ابو العباس احمد سرخسی (المتوفی: ۳۸۶ھ) صدقۃ بن منجا الدمشقی (۲۶۰ھ) مؤرخ مشہور مسعودی (۳۴۶ھ) امام غزالیؒ (۵۰۵ھ) امام رازیؒ (۶۰۶ھ) ابن القیمؒ (۷۵۲ھ) برہان الدین بقاعیؒ (۸۸۵ھ) وغیرہ وغیرہ متکلمین اسلام اور علماء امت نے ''روح'' پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ''معارج القدس'' غزالیؒ کی اور ''کتاب الروح'' ابن القیمؒ کی اور ''سر الروح'' بقاعی کی اور ''

(۱) ملاحظہ ہو: ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے حسب ذیل ابواب، ذکر الملأ الأعلٰی، ص: ۱۲، باب التکلیف، ص:۱۵، انشقاق التکلیف من التقدیر، ص:۱۶، اقتضاد التکلیف من المجازاۃ، ص:۱۹، اختلاف الناس فی جبلتہم، ص:۲۰، حقیقۃ السعادۃ، ص:۳۹، اختلاف الناس فی السعادۃ، ص:۴۰، الحاجۃ إلٰی ہداۃ السبل، ص: ۶۵، حقیقۃ النبوۃ، ص:۶۶، کیفیۃ الاستنباطات، ص:۳۰۔۳۱، باب الارتفاق الأول، ص:۳۰)

(۲) ملاحظہ ہو تفصیل کے لیے: کشف الظنون، ج:۲، ص:۲۴۸، ۳۰۴)

کتاب الفتوح لمعرفۃ أحوال الروح''بعض علماء عصر کی اور''ألطاف القدس'' شاہ ولی اللہؒ کی ہمارے سامنے مطبوعہ موجود ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ حقیقتِ نبوت کی تشریح کے لیے''حقیقتِ روح'' بیان کرنا ضروری ہوگی۔اس وقت ان غامض و دقیق علمی موضوعات کی طرف جانا نہیں اور نہ فیصلہ کرنا ہے۔صرف اپنے سلف صالحین کے چند علمی کارناموں سے طلبہ کو واقف کرانا تھا، کوئی مشکل سے مشکل، دقیق سے دقیق علمی موضوع اور خصوصاً جس کا تعلق دین اسلام سے ہو ایسا نہیں ہوگا جس پر کہ ہمارے اکابر نے اپنی بیش بہا تحقیقات کا ذخیرہ جمع نہ کیا ہو۔اس وقت مقصود صرف اتنا ہے کہ یہ بتلایا جائے کہ''نبی''(پیغمبر) کسے کہتے ہیں؟ اور قرآن کریم میں''انبیاء'' اور''نبوت'' کے کیا کیا خواص بتلائے گئے ہیں؟ تا کہ آیاتِ بینات کی روشنی میں ایک مسلمان صحیح عقیدہ کو سمجھ سکے، اور جب کسی کی نبوت ثابت ہوجائے مسلمان کے لیے ان کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہوگا اور جب ایمان لایا گیا اس وقت''نبی'' ایک امتی کے لیے ایک برگزیدہ مقدس واجب الاطاعت ہستی ہوگی۔اس کے احکام، اس کی مرضیات، اس کے اوضاع واطوار، اس کے اخلاق وعادات، غرض کل نظامِ حیات میں اس کی سنت افرادِ امت میں سے ہر فرد کے لیے دلیل راہ ہوگی۔ پھر وہاں کیوں؟ اور کیوں کر؟ کا سلسلہ ہی ختم ہوجاتا ہے۔سوائے تسلیم وانقیاد واطاعت وفرمانبرداری کے کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔اس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔اس کی رضامندی خدائے تعالیٰ کی رضامندی ہوتی ہے، اس لیے کہ خود حق تعالیٰ یوں ہی فرما چکے ہیں، جیسا کہ آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ! واضح ہوجائے گا۔ ہاں! عبادت بہر حال اللہ تعالیٰ کی ہوگی، رسول کی اطاعت سے اس کی عبادت لازم نہیں آتی، عبادت وبندگی اور چیز ہے، اطاعت وتسلیم اور چیز ہے، دونوں میں خلط نہ کرنا چاہیے۔مقصد صرف اتنا ہے کہ رسول کی رہنمائی میں اللہ تعالیٰ شانہٗ کی عبادت وبندگی کی جائے۔اب وہ رہنمائی مختلف صورتوں میں ہوگی، کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف صاف طور پر نسبت کر کے ارشاد فرمایا جائے گا، کبھی اپنی طرف سے کچھ ارشاد فرمائیں گے، گو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا۔لیکن لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی نسبت نہیں ہوگی، کبھی ان کے اتباع، ان کے طرز وطریقہ کو دیکھ کر رہنمائی حاصل کریں گے۔غرض کہ رہنمائی حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہوں گے۔ نبی ورسول یا پیغمبر لغت عرب میں''نبأ''اس خبر کو کہتے ہیں جس میں فائدہ ہو اور فائدہ بھی عظیم اور اس خبر سے سننے والے کو علم واطمینان بھی حاصل ہو۔(۱) غرض کہ تین چیزیں اس میں ضروری ہوں ا:......خبر فائدے ۲:......فائدہ بھی عظیم الشان ہو، ۳:...... سننے والے کو یقین کامل یا اطمینان

(۱) ملاحظہ ہو''مفرداتِ راغب''ص:۴۹۹۔ابن تیمیہؒ نے''النبوات''میں اسی کو دوسرے عنوان سے بیان کیا اور کسی قدر اور لطیف کر دیا۔دیکھو''النبوات''،ص:۲۲۲ کی ہو،۲

قلب حاصل ہوجائے۔قرآن کریم نے اسی لغت سے ’’نبی‘‘ کا لفظ ایک ایسے انسان کے لیے استعمال کیا جس نے اللہ تعالیٰ کے بندوں کواللہ تعالیٰ کی جانب سے فائدے اور نفع کی ایسی عظیم الشان خبریں سنائیں جن سے ان کی عقول قاصر ہیں،صرف اپنی عقلِ نارسا سے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ظاہر ہے کہ ایسی باتیں وہی ہوں گی جو اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہوں گی اور پھر ان خبروں پر اطمینان یا علم جب حاصل ہوسکتا ہے کہ خبر دینے والا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل بھی پیش کرے یا صرف اس کی زندگی ہی اتنی پاکیزہ، اتنی اعلیٰ ومقدس ہو کہ اس پر جھوٹ کا وہم وگمان بھی نہ ہوسکے، اس کی بات سنتے ہی لوگوں کو یقین آجائے۔اب صرف ’’نبی‘‘ کا لفظ ہی لغتِ عرب کے مطابق ان سب حقائق پر روشنی ڈالتا ہے، جس کی تفصیل وتحقیق کے لیے صفحات بھی ناکافی ہیں۔شیطانی وساوس یا طبعی جحود وعناد اگر قبول سے مانع آجائے یہ دوسری بات ہے۔’’رسالت‘‘ لغتِ عرب میں ’’رسالت‘‘ کے معنی ایک پیغام کے ہیں اور ’’رسول‘‘ کہتے ہیں پیغام پہنچانے والے کو۔قرآن کریم نے اس لفظ کو اس پیغام پہنچانے والے کے لیے استعمال کیا جو اللہ تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے دین ودنیا کے مصالح کے بارے میں پیغامات اس کے بندوں تک پہنچائے۔اب خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام کی زبان میں ’’نبی ورسول‘‘ وہ سفیر ہے جس کا خود اللہ تعالیٰ نے انتخاب فرمایا ہو۔خدائے تعالیٰ کے پیغامات اس کے بندوں تک پہنچاتا ہو، دین ودنیا کے مصالح ومنافع کے لیے ایک ’’قانونِ حیات‘‘ ایک ’’نظام العمل‘‘ ایک ’’دستورِ اساسی‘‘ پیش کرتا ہو۔ایسے احکام، ایسے حقائق، ایسے امور اُن کو ارشاد کرتا ہو جن سے ان کی عقول قاصر ہوں۔ایسی دقیق وغامض باتوں کی اطلاع دیتا ہو جہاں ان کا طائرِ عقل پرواز نہ کرسکتا ہو، ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرتا ہو، نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی وعذاب سے ڈراتا ہو۔جو حکم دیتا ہو وہ خود کرتا ہو، خود اُن کے لیے مجسم پیکرِ عمل ہو، اس قانونِ حیات ونظامِ عمل کے لیے اس کا وجود آئینہ ہو۔یہ ہیں اسلام کی زبان میں، شریعت کی لغت میں ’’رسول ونبی‘‘ کے معنی، اسی کو ہم اپنی زبان میں ’’پیغمبر‘‘ کہتے ہیں۔’’رسول‘‘ و’’نبی‘‘ میں کیا فرق ہے؟ یہ ایک محض علمی چیز ہے۔ ہمارے موضوع سے خارج ہے، لیکن اجمالاً اتنا واضح رہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے ’’کتاب النبوات‘‘ میں جو فرق بیان کیا وہ ہمیں سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے، جس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ: ’’جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے صرف غیب کی خبروں سے قوم کو اطلاع دیتا ہو، ان کو نصیحت کرتا ہو، ان کی اصلاح کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کو ’وحی‘ ہوتی ہو، وہ ’’نبی‘‘ کہلاتا ہے۔اگر ان اوصاف کے ساتھ وہ کفار کی طرف اور نافرمان قوم کو تبلیغ پر مامور بھی کیا جائے تو وہ ’’رسول‘‘ بھی ہوگا۔‘‘(۱) اب ہم قرآن کریم کی

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ’’کتاب النبوات‘‘ ص:۲۷۲ تا ۲۷۴

روشنی میں ''انبیاء ورسل'' کے خواص ولوازم پیش کرتے ہیں، لیکن معلوم رہے کہ ''انبیاء ورسل ﷺ'' کے عام خصائص بحیثیت نبوت ورسالت سب مشترک ہیں، قرآن کریم نے جتنے کمالات اور اوصاف انبیاء ورسل کے بیان کردیئے ہیں وہ سب حضرت خاتم الانبیاء رسول اللہ ﷺ میں بوجہ کمال موجود ہیں، کیونکہ آپ ﷺ سب انبیاء ورسل سے افضل ہیں۔ آپ ﷺ سید الانبیاء ہیں، خاتم الانبیاء ہیں۔ یہ نصوصِ قطعیہ کا مفاد ہے اور اُمتِ مرحومہ کا ''اجماعی عقیدہ'' ہے اور تاریخ عالم کی ''حقیقتِ ثابتہ'' ہے اور اسلامی دور کے حیرت انگیز کارنامے اس کے شاہدِ عدل ہیں۔ قرآن کریم نے بہت سے انبیاء ورسل کے خصائص وکمالات بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ کو حکم دیا اور فرمایا:

''أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔'' (الانعام: ۹۰)

''یہ حضرات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے، آپ بھی انہیں کے طریقہ پر چلئے۔'' اس سے یہ صاف معلوم ہوا کہ انبیاء کے جتنے عملی وعلمی کمالات تھے، آپ ﷺ ان سے مالا مال تھے۔ اس لیے ہم جتنی آیاتِ کریمہ مختلف انبیاء ورسل کے خصائص واوصاف میں پیش کریں گے۔ مقصود ان سے صرف نبوت کے کمالات وخصائص ہوں گے جو اصل نبوت کی وجہ سے قدرِ مشترک سب میں موجود ہیں۔ منصبِ نبوت ورسالت نبوت ایک عطیۂ ربانی ہے جس کی حقیقت تک رسائی غیر نبی کو نہیں ہوسکتی، اس کی حقیقت کو یا تو حق تعالیٰ جانتا ہے جو نبوت عطا کرنے والا ہے یا پھر وہ ہستی جو اس عطیہ سے سرفراز ہوئی۔ مخلوق بس اتنا جانتی ہے کہ اس اعلیٰ وارفع منصب کے لیے جس شخص کا انتخاب کیا گیا ہے وہ:

۱......معصوم ہے، یعنی نفس کی ناپسندیدہ خواہشات سے پاک صاف پیدا کیا گیا ہے اور شیطان کی دسترس سے بالاتر۔ عصمت کے یہی معنی ہیں کہ ان سے حق تعالیٰ کی نافرمانی کا صدور ناممکن ہے۔

۲......آسمانی وحی سے ان کا رابطہ قائم رہتا ہے اور وحی الٰہی کے ذریعہ ان کو غیب کی خبریں پہنچتی ہیں۔ کبھی جبریل امین کے واسطہ سے اور کبھی بلا واسطہ، جس کے مختلف طریقے ہیں۔

۳......غیب کی وہ خبریں عظیم فائدہ والی ہوتی ہیں اور عقل کے دائرے سے بالاتر ہوتی ہیں، یعنی انبیاء بذریعہ وحی جو خبریں دیتے ہیں ان کو انسان نہ عقل وفہم کے ذریعہ معلوم کرسکتا ہے نہ مادی۔

آلات وحواس کے ذریعہ ان کا علم ہوسکتا ہے۔ ان تین صفات کی حامل ہستی کو مخلوق کی ہدایت کے لیے مبعوث ومامور کیا جاتا ہے، گویا حق تعالیٰ اس منصب کے لیے ایسی شخصیت کا انتخاب فرماتا ہے جو افرادِ بشر میں اعلیٰ ترین صفات کی حامل ہوتی ہے، اس انتخاب کو قرآن کریم کہیں ''اجتبائ'' سے، کہیں ''اصطفاء''

سے اور کبھی لفظ ''اختیار'' سے تعبیر فرماتا ہے، یہ عام صفات وخصوصیات تو ہر نبی ورسول میں ہوتی ہیں، پھر حق تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرما کر وہ درجات عطا کرتا ہے جن کے تصور سے بھی بشر قاصر ہے، گویا نبوت، انسانیت کی وہ معراج کمال ہے جس سے کوئی بالاتر منصب اور کمال عالمِ مکان میں نہیں، ان صفاتِ عالیہ سے متصف ہستی کو ہدایت واصلاح کے لیے مبعوث کر کے انہیں تمام انسانیت کا مطاعِ مطلق ٹھہرایا جاتا ہے، ارشاد ہے:

''وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ'' (النساء: ٦٤)

یعنی ''ہم نے ہر رسول کو اسی لیے بھیجا کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔'' پس حکمِ خداوندی یہی ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، وہ مطاع اور واجب الاطاعت متبوع ہے، اور امت اس کی ہدایت کے تابع اور مطیع فرمان۔ نبی ہر نقص وکوتاہی سے بالاتر ہوتا ہے جب نبوت ورسالت کے بارے میں یہ صحیح تصور قائم ہوگیا کہ وہ ایک عطیہ ربانی ہے، کسب ومحنت اور مجاہدہ وریاضت سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ حق تعالیٰ اپنے علم محیط، قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے پاک اور معصوم ومقدس ہستی کو پیدا فرما کر اس کو وحی آسمانی سے سرفراز فرماتا اور مخلوق کی ہدایت وارشاد کے منصب پر اُسے کھڑا کرتا ہے تو اس سے عقلی طور پر خود بخود یہ بات واضح ہوگئی کہ نبی ورسول کی شخصیت ہر نقص سے، ہر کوتاہی سے اور ہر انسانی کمزوری سے بالاتر ہوتی ہے، کیونکہ اگر خود اس کی شخصیت انسانی کمزوریوں میں ملوث ہو تو وہ ہدایت واصلاح کی خدمت کیسے انجام دے سکے گا:

آنکہ خود گم است کرا رہبری کند

چنانچہ سنت اللہ یہی ہے کہ نبی کا حسب ونسب، اخلاق وکردار، صورت وسیرت، خلوت وجلوت اور ظاہر وباطن ایسا پاک اور مقدس ومطہر ہوتا ہے جس سے ہر شخص کا دل ودماغ مطمئن ہو اور کسی کو انگشت نمائی کا بال برابر بھی موقع نہ مل سکے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص شقاوتِ ازلی کی وجہ سے اس کی دعوت پر لبیک نہ کہے اور جحود وانکار میں مبتلا ہو کر ہدایت سے محروم رہ جائے، لیکن یہ ممکن نہیں کہ بدتر سے بدتر دشمن بھی نبی میں کسی ''انسانی کمزوری'' کی نشاندہی کر سکے۔

......◆......

آخری قسط

حضرت علامہ کے درسِ حدیث کی خصوصیات

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی کشمیریؒ
بانیٔ جامعہ ہٰذا

ایک مولانا گیلانی ہی کیا، خیر القرون کے اختتام کے ساتھ ہی دین کے اسی انتساب کے بارے میں نہ جانے کیسے کیسے ہولناک مغالطوں میں عوام مبتلا کردیئے گئے اور عصر حاضر کے مہیب فتنوں میں تو حدیث کو عجمی سازش قرار دے کر دیدہ دانستہ دین کے اہم و بنیادی ستون ہی پر حملہ کردیا گیا، عجمی سازش کا شوشہ چھوڑنے والوں نے اپنی چابک دستیوں سے لے کر ہیچ پوچ دلائل اس مقصد کے لئے تلاش کئے ہیں۔ انہیں سے مرعوب ہوکر بلا مبالغہ لاکھوں تک تعداد ان سادہ لوح مسلمانوں کی پہنچتی ہے جو صاحب شریعت کی جانب حدیث کا انتساب مشتبہ گردان رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کے خدام درس کے حلقوں میں بھی اس زہر کا تریاق بہم پہنچاتے رہیں۔ یقین ہے کہ اگر طلبہ کے ذہنوں میں دلائل کے ساتھ یہ بات ڈال دی گئی کہ حدیث کوئی عجمی سازش نہیں بلکہ ایک بنیادی عنصر ہے اور مناسب ہتھیاوں سے انہیں مسلح کردیا گیا تو منکرین حدیث کی زہر چکانیوں کا شافی علاج ہوسکے گا۔ الامام کشمیری کو خدا تعالیٰ نے فتنوں کو بھانپ لینے اور ان کا ضروری مقابلہ کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ بالکل ابتدائی مرحلوں میں طلبہ کے روبرو حجیت حدیث کے موضوع پر ایسی فاضلانہ تقریر فرماتے جس سے حدیث کی حجیت ایک حقیقت نظر آتی۔ ممدوح گیلانی نے تفصیل سناتے ہوئے بتایا ہے کہ:

> ’’پہلا دن تھا جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا تواتر طبقہ، تواتر عمل، تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سنا، سمجھا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تواتر کا دعویٰ عام کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ صرف اسناد والے تواتر کی حد تک محدود ہے، ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ، تواتر مشترک کی راہ سے منتقل ہوکر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہنچا ہے اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے جو قوت اسناد والے

تواتر میں پائی جاتی ہے۔''(۱)

دین کے اس اہم اور ضروری عنصر پر جو فاضلانہ دلائل بہم پہنچائے گئے ان کو سن کر مرحوم گیلانی نے اپنے متعلق یہ شہادت دی ہے:

''یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا نظام میرے لئے یقینی وقطعی ہوگیا اور جیسے جیسے تمیز وشعور میں عمر کے لحاظ سے اضافہ ہوا بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا۔''

خاکسار نے ابھی عرض کیا تھا کہ درسی افادات میں معلم واستاذ اس نہج پر اگر دماغوں کی آبیاری کرتے رہے تو دین کی جانب سے دفاع کرنے والوں کا جو مضبوط حلقہ قائم ہوگا وہ درس گاہوں سے لی ہوئی روشنی سے ہمیشہ کام لیتا رہے گا۔

چنانچہ فاضل گیلانی نے اپنے متعلق خود لکھا ہے کہ:

''خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا ـــــــ بلکہ مسلمانوں کے دینی اختلاف کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا۔''

بہر حال درس میں جامعیت اور وسیع ترین افادی معلومات جو شاہ صاحب کی دُربار زبان سے ظاہر ہوئے اس سے جہاں ایک فائدہ وہ تھا جسے مولانا محمد طیب صاحب نے لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم وفن کا مذاق لے کر اٹھتا اور اس میں یہ استعداد پیدا ہوجاتی کہ وہ بضمن کلام خدا اور رسول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جائے۔ یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام الکشمیری نے اختیار فرمایا۔''

---

(۱) تواتر کی ان اقسام چہارگانہ کو مرحوم گیلانی ہی کے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً ان ہی باتوں میں ہوئی ہے جو روایت کی راہ سے منتقل ہوئی ہوں، لیکن ایسی بات کہ شاہ جہاں ہندوستان کا حکمراں تھا یا سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنے والے ان کے کون ہیں جنون کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر مثلاً پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے، سال میں جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ مسلمانوں کو رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں، جسے مسلمان ہی نہیں بلکہ جو مسلمان نہیں ہیں ان کے نزدیک بھی اسلام کے یقینی عناصر ہیں۔ یہی تواتر عمل کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح حاتم کی سخاوت، رستم کی شجاعت، اگرچہ گزرے ہوئے واقعات ہیں، لیکن ان کی تفصیلات مثلاً حاتم کی طرف سخاوت یا رستم کی بہادری کے جو قصے مشہور ہیں ان قصوں کا یقینی ہونا تو ضروری نہیں لیکن ان قصوں کا قدر مشترک یعنی حاتم سخی تھا، رستم بہادر آدمی تھا اس قدر مشترک کے یقینی ہونے میں کون شبہ کرسکتا ہے۔ الاستاذ عثمانی مولانا شبیر احمد مرحوم نے بھی صحیح مسلم میں تواتر کی ان قسموں کا ذکر کر کے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ حضرت علامہ کشمیری ہی سے یہ بات سننے میں آئی ہے۔

مولانا طیب صاحبؒ ہی کے قلم نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک ملفوظ سے اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا کہ درس کا آپ کا یہ اجتہادی طرز دورِحاضر کے فتنوں کے مقابلہ کی سوچی سمجھی تیاری تھی۔

چنانچہ آپ خود درس میں طلبہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

''بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلے میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے۔''

موصوف کے اس ارشاد سے یہ واضح ہوا کہ درس میں مختلف عنوانات سے متعلق تقریر اپنے علم کا اظہار یا اپنے تبحر کا مظاہرہ نہیں تھا، بلکہ آپ طلبہ کو نت نئے فتنوں کے مقابلے میں اس طرح مسلح کر دینا چاہتے تھے کہ وہ دین کی جانب سے دفاع کر سکیں۔ آج دارالعلوم کی ممتاز پچاس سالہ تاریخ جس کی ابتدا آپ کی تدریس و تعلیم سے ہوتی ہے، شاہد ہے کہ آپ کی درس گاہ سے نکلے ہوئے فضلا اپنی اپنی جگہ دین کی حمایت و نصرت میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ بہر حال مرحوم کی درسی خصوصیات میں سے اب تک دو بنیادی خصوصیات کا ذکر آیا۔ آپ کے درس کی تیسری اہم خصوصیت وہ ہے جس کے ناقل ملک کے مشہور عالم و فاضل مولانا محمد ادریس کاندھلوی شارح مشکوٰۃ و شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ہیں۔ حسب معمول مولانا کاندھلوی نے اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل سے کام لیا ہے۔ اس تفصیل کے بغیر مولانا کا مقصد واضح نہیں ہوتا۔ اس لئے خاکسار بھی مفصل پیش کرتا ہے، لکھا ہے کہ:

''دنیا کے علم میں خیر و شر، محمود و مذموم کی تقسیم ہے، مگر آخرت اور دارین کے علم میں یہ تقسیم نہیں، آخرت اور دین خداوندی کا علم خیر ہی خیر اور محمود ہی محمود ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اول مرتبہ ایمان و اسلام کا ہے اور اس کے بعد علم دین کا ہے۔''

اس کے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ علم کے لئے دو قوتیں درکار ہیں، ایک قوت فہم دوسری قوتِ حافظہ۔ تحریر فرمایا کہ:

''حضرت شاہ صاحب مرحوم کو خدا تعالیٰ نے ان تمام قوتوں سے اس طرح سرفراز فرمایا تھا کہ عالم میں اس وقت اس کی نظیر نہیں۔''

بلکہ طبقۂ علما میں آپ کی خصوصیت و امتیاز یہ تھا کہ:

''جب کوئی عالم کسی مسئلہ میں شاہ صاحب کی طرف مراجعت کرتا تو مسئلہ کا مادہ اس کے سامنے کر دیتے اور اس کے بعد اپنا فیصلہ بھی بتا دیتے کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں میری رائے یہ ہے۔''

جس کا حاصل یہی نکلا کہ خام علم اور ناپختہ آگہی کے جو مظاہر آئے دن ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں کہ اگر کسی سے کوئی بات پوچھی جائے تو اول تو بے چارہ شاید اس علم کے بارے میں ظنی و تخمینی رائے بھی نہ رکھتا ہو اور اگر مختلف اقوال نقل بھی کر دے تو راجح اور مرجوح کی تعیین سے بہر حال محروم ہی ہو گا، لیکن علامہ کا یہ حال تھا کہ:

''ہر مسئلہ آپ کے نزدیک طے شدہ تھا، اختلافِ اقوال کی وجہ سے تذبذب اور تردد نہیں بلکہ

راجح اور مرجوح متعین رہتا۔''

جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا کاندھلوی اپنے جلیل القدر استاذ کی جس خصوصیت کا ذکر کر رہے ہیں وہ فنی مہارت اور علمی حذاقت کی دوسری تعبیر ہے، نقول کے انبار سے کارآمد چیز اٹھا لینا اس وقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ علم ملکۂ راسخہ نہ بن جائے۔ اس خصوصیت کے بعد فاضل مضمون نگار نے شاہ صاحب کے خداداد فہم کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''فہم کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلہ کی اصل اور اس کا سرا معلوم تھا، اصل کلی کے بتلا دینے کے بعد یہ بتلا دیتے تھے کہ فلاں فلاں مسئلہ اس اصل پر متفرع ہے اور ان مسائل مختلف فیہ میں ما بہ الاشتراک اور ما بہ الاختلاف یہ ہے۔''

ظاہر ہے کہ اختلاف اور قدر مشترک کی بنیادوں کو متعین کرتے ہوئے مسئلہ کی روح پر اطلاع خود مولانا کے الفاظ میں کہ ''یہ طریق نہایت دقیق اور عمیق ہے۔''

تاوقتیکہ اختلافِ علماء کے پس منظر پر پوری اطلاع نہ ہو تمیز و امتیاز کی یہ قوت و صلاحیت ممکن نہیں۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں کہ:

''جب تک روایاتِ مختلفہ میں فقہائے کرام کا منشاء خلاف اور سبب اختلاف معلوم نہ ہو مسئلہ کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی۔''

اس کے بعد فاضل کاندھلوی نے علامہ کے درس حدیث کی بنیادی خصوصیات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے یہ بھی سنایا کہ:

''درسِ حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت و بلاغت واضح ہو جائے، کوشش اس کی فرماتے کہ حدیث کی مراد علمی اصطلاحات کے تابع نہ رکھا جائے۔ یہ اس لئے کہ ''اصطلاحات بعد میں حادث ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً و رتبۃً مقدم ہیں، اور یہ ساری کوشش اس لئے ہوتی کہ ''حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلافِ ادب ہے۔''

جو شخص مسائل و مباحث میں ان بنیادی اصول پر پوری بصیرت رکھتا ہو جس اصل پر یہ مسائل پھیلے ہوئے ہیں، اس کی تعلیم و تدریس افادی نقطۂ نظر سے بڑی جامع ہوگی، قوت حافظہ نقول کی حد تک طلبہ کے سامنے اقوال کا انبار لگا سکتی ہے، لیکن فہم ثاقب کی جلوہ طرازیاں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ علامہ مرحوم کے درس کی یہی بڑی خصوصیت تھی کہ آپ اقوال میں اپنے خداداد فہم سے کام لے کر ترجیح بھی جاری فرما سکتے تھے۔ مولانا کاندھلوی نصف صدی سے درس گاہی ضرورتوں پر تام اطلاع رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کی نظر درس کے اس امتیازی پہلو پر جا پہنچی جو طلبہ کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے۔ حدیث، قرآنی بیانات و مضامین

کی ایک واقعاتی تشریح ہے۔ غالباً اسی لئے الشافعی الامام کو کہنا پڑا کہ قرآن جس قدر حدیث کا محتاج ہے، حدیث اتنی قرآن کی نہیں، اوکما قال۔ مطلب اس کا یہی ہوا کہ قرآن کے مجملات کو حدیث ہی سے سمجھنا ممکن ہے جب کہ حدیث بجائے خود اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اس کی مراد کی تعیین کے لئے کوئی تشریح درکار نہیں۔ اس اہم حقیقت کے پیش نظر علامہ نے درس میں اس کا بھی اہتمام فرمایا تھا کہ قرآن مجید کی ان آیات کی تعیین فرمادیں جو حدیث کا ماخذ یا حدیث جن اجمال کی شرح ہے۔

مولانا کاندھلوی لکھتے ہیں:

''حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے۔''

اس التزام کا سب سے بڑا افائدہ یہ ہوتا کہ:

''بہت سی مشکلات قرآنیہ کو حل فرمادیتے۔''

گویا کہ آپ کا درس حدیث ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ دین کی اولین اور اہم بنیاد قرآن مجید کو بھی حل فرما کر طلبہ کی واقفیت کے دائرہ کو وسیع کیا جاتا۔ مولانا گیلانی اپنے فاضلانہ مقالہ میں شاہ صاحب کی اس درسی خصوصیت کا خصوصی تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم سے متعلق آپ کے مخصوص نظریات کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہے کہ حدیث کی صحت وعدم صحت تمام تر راویوں کے احوال پر قائم ہے اور اسی ضرورت سے اسماء الرجال نامی فن کو محدثین نے ایجاد بھی کیا اور اختیار بھی، حدیث کی یہی وہ ضرورت ہے جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے مختصر ارشاد کے ساتھ سند کا طویل اضافہ کر دیا گیا۔ افسوس کہ آج ہماری درس گاہوں میں جن بنیادی علوم وفنون سے صرفِ نظر کی جارہی ہے، ان میں اسماء الرجال بھی ہے۔ اسماء الرجال ہی کی طرح اس کا دوسرا ضروری شعبہ جرح وتعدیل بھی اکثر چھوڑ دیا گیا۔ مذہبی وفقہی تعصب کی بنا پر بہت سی وہ روایتیں قبول کر لی جاتی ہیں جو کسی خاص مکتبۂ فکر کی تائید کرتی ہوں، حالاں کہ اگر فنی نقطۂ نظر سے جانچ پڑتال کی جائے تو سلسلۂ سند میں وہ شخصیتیں نظر آئیں گی جن کی حیثیت مجروح ہے یا ان روایات پر ناروا جرح کا دفتر ہی ملے گا جس کی روایت کسی ناپسندیدہ فقہی اصول کی تائید کرتی ہو، اس لئے کوئی بالغ النظر عالم ہی ردوقبول کے ان ناملائم فیصلوں پر انصاف کی بات کہہ سکتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے فنون کو ان درس گاہی علوم میں داخل کیا جاتا جن کی باقاعدہ تعلیم دی جارہی ہے، مگر اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے فن سے اس غفلت کا کیا شکوہ، درسگاہوں میں اصولِ حدیث کے فن کو بھی بڑی حد تک ترک کر دیا گیا۔ بقول شاعر:

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

حافظ ابن حجر عسقلانی کی ''نخبۃ الفکر'' اصولِ حدیث میں ہماری درس گاہوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اس کی بھی تعلیم جس لئے دیئے انداز میں ہوتی ہے اس سے کچھ ہمارے طلبہ ہی واقف ہیں۔ بہر حال شاہ صاحب مرحوم نے حدیث کی اس بڑی ضرورت کا خیال فرما کر راویوں سے متعلق مناسب تفصیل کا بھی

التزام اپنے درس میں فرمایا۔اسی سلسلہ میں مولانا کاندھلوی کا بیان ہے:

”اسماء الرجال پر کلام فرماتے خصوصاً جن رواۃ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے، جرح و تعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنا قول فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابل قبول ہے اور یہ کہ اس کی روایت حسن کے درجہ میں رہے گی یا صحیح کے درجہ میں؟ یا قابل رد ہوگی یا قابل اغماض؟ زیادہ تر فیصلہ کا یہ طریقہ ہوتا کہ جب کسی راوی کے جرح وتعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ فرماتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔“

اسماء الرجال کا یہی فن جو قوتِ حافظہ کا مطالبہ کرتا ہے اور ساتھ ہی وسعت مطالعہ کا بھی، حدیث کے طول وطویل دفتر میں ناقدین نے جہاں کہیں کسی راوی کی تعدیل کی ہے اور پھر کسی مذہبی عصبیت کی بنا پر اسی راوی کو مجروح قرار دیا ہے اس کی تعدیل سے فائدہ اٹھانے کے لئے حدیث کے پورے ذخیرہ پر واقفیت کی ضرورت ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو یادداشت کی غیر معمولی قوت کے ساتھ جو وسعت نظر عطا فرمائی تھی اس سے کام لے کر احناف کے لئے مفید روایتوں اور راویوں سے آپ کام لیتے اور سلسلہ میں شافعی المسلک علماء کی زیادتی پر خصوصی توجہ دلاتے جس کا مقصد احناف کے لئے مفید روایت اور روات کی بیخ کنی ہوتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری سے آپ کی غیر معمولی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جبل العلم، حافظ الدنیا سے آپ کا اشارہ ابن حجر کی جانب ہوتا، لیکن جب محسوس فرماتے کہ ابن حجر دانستہ کف لسانی سے کام لے رہے ہیں اور حنفیہ کے لئے کسی مفید روایت سے سرد مہری کا معاملے کر رہے ہیں تو ابن حجر کے اس طرز کو طوطے کی چال سے تشبیہ دیتے جو آنکھوں کو گردش دے کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اختلافی حدیثوں کے بارے میں شوافع کے یہاں اصح مافی الباب (یعنی اس باب میں سب سے زیادہ صحیح حدیث یہ ہے) کا جو ترجیحی طریقہ جاری ہے اس کا جب کبھی ذکر آتا تو فرماتے کہ لیجئے علماء شافعی نے پٹھے ٹٹولنے کا کام شروع کر دیا۔ اس علمی لطیفہ کی دلچسپ تفصیل فاضل گیلانی سے سنئے، لکھتے ہیں کہ:

”اسماء الرجال کی کتابوں کو اٹھا کر راوی پر جرح کر کے مخالف کی حدیث کو ناقابل لحاظ بنا دینا اور صرف رجالی رجسٹروں کی مدد سے کسی روایت کو ترجیح دینا اور آثارِ صحابہ، قرآنی آیات کے اقتضا اور اسلام کے کلی قوانین و اصول سے چشم پوشی حضرت شاہ صاحب شافعیوں کے اس طرز کو روایتوں کی رتر جیح میں پسند نہیں فرماتے تھے۔ جرح کے لئے رجالی رجسٹروں میں راوی کی کمزوریوں کو ٹٹولنا اسی کا نام انہوں نے پٹھا ٹٹولنا رکھ لیا تھا۔ فرماتے کہ یہ قصابوں کا کام ہوا کہ جو جانور کمزور نظر آیا اسی کو پٹخ کر ذبح کر ڈالا“

عرض کر چکا ہوں کہ فن حدیث کا یہ اہم ترین شعبہ یعنی اسماء الرجال غیر معمولی اہمیت کا مقتضی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ حجاج بن ارطات کی ایک روایت جو کسی مسئلہ میں احناف کے لئے مفید ہے، شوافع نے روایت کو

نا قابل قبول ٹھہرانے کے لئے حجاج کی شخصیت پر جوتابڑتوڑ حملے کئے ہیں، ان میں ایک بڑااعتراض یہ بھی کیا گیا کہ وہ باجماعت نماز کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ علامہ نے فرمایا کہ یہ انصاف کی بات نہیں کہ حجاج کو اس جرم کی وجہ سے متروک قرار دیا جائے دراں حالے کہ امام دارالہجرت مالک ابن انس ایک مدت تک مسجد میں تشریف نہیں لائے اور اس کے باوجود الامام کی روایتیں بدستور قابل قبول ہیں۔ حجاج کی مدافعت میں جودقیقہ شاہ صاحب نے دریافت فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کس دقت نظری سے اس فن کا مطالعہ فرمایا تھا۔ غرضیکہ اسماء الرجال جوفن حدیث کا ایک نہایت ہی ضروری اور اہم عنصر ہے شاہ صاحب اس فن کی اہمیت کے پیش نظر درس میں اس کا باقاعدہ اہتمام فرماتے۔ اسماء الرجال ہی نہیں بلکہ درس حدیث میں جن تصانیف اور تالیفات کے حوالے پیش کرتے ان کے مصنفین ومؤلفین کے حالات، مصنف کا علمی پایہ اور خود اس کتاب کی ثقاہت پر ایک جامع تبصرہ بھی ہوتا جس سے طلبہ کو مختصر وقت میں سیر وسوانح کے ساتھ کتاب کی علمی حیثیت بھی معلوم ہوتی اور اس طرز سے نئی کتابوں کے مطالعہ کا شوق وزوق بھی پیدا ہوتا۔

فاضل گیلانی ہی لکھتے ہیں:

> ''وہ اپنے عہد کے طلبہ کی علمی بے بضاعتیوں کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوعِ درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے تھے، مثلاً جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے ان کی ولادت و وفات سنین کے ساتھ ساتھ مختصر حالات اور ان کی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے۔ ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔ یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا جس کی بدولت شوقین اور محنتی طلبہ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز وسامان سے مسلح ہوجاتے یا کم ازکم مسلح بننے کا ڈھنگ ان کو آجاتا تھا۔''

لیکن اسماء الرجال کی طرح یہ کام بھی انتہائی دشوار ہے، غیر معمولی حافظہ کے ساتھ وسیع مطالعہ اس سنگلاخ وادی کو طے کرنے کے لئے ضروری ہے اور اسی لئے عام مدرسین واساتذہ اگر اس کا اہتمام نہیں کر پاتے تو انہیں معذور سمجھنا چاہئے۔

فاضل گیلانی نے بھی لکھا ہے:

> ''لیکن سچ یہ ہے کہ ہر غریب مدرس واستاذ کے بس کی یہ بات بھی نہیں کہ مطالعہ کئے بغیر جس عالم کا ذکر آجائے اس کے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات سے طلبہ کو آگاہ کرنے پر قادر ہو، یہ تو ان کے خصوصی حافظہ کا کمال تھا۔''

مشفقانہ افادہ کے وہ جذبات جو موصوف میں بقوت موجود تھے جس کے تقاضوں کی بنا پر آپ نے اپنے حلقۂ درس میں شریک طلبہ کی مناسب تربیت کے لئے جن ذیلی اضافوں کا اہتمام فرمایا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دوسرے فن کے اہم مسائل خصوصاً اختلافی مباحث پر واقف کارانہ کلام فرما کر اختلاف کی ابتدا وانتہا اور

محاکمہ کرتے ہوئے قولِ فیصل سے بھی طلبہ کو اطلاع کردیتے، جیسا کہ مولانا گیلانیؒ نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

’’عموماً وہ اس کا بھی موقع تلاش کرتے کہ علاوہ حدیث کے اسلامی علوم کے طلبہ وعلماء کے لئے دوسرے متعلقہ علوم وفنون کے جن اصول وکلیات کا جاننا ضروری ہے۔ ان کا بادنیٰ مناسبت ذکر فرماتے اور مسئلہ کی ایسی تاریخ بیان کرتے جس کے سننے کے بعد معلوم ہوجاتا تھا کہ اس مسئلہ کی ابتدا کس شکل میں ہوئی اور کن کن نقاطِ نظر سے گزرتے ہوئے موجودہ حال تک پہنچا۔‘‘

اس ساری کدوکاوش سے مقصود طلبہ کے ساتھ ان کی وہ غیر معمولی شفقت تھی جس سے ان کا قلب معمور تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طلبہ کو اس طرح تیار کردیں کہ آئندہ علمی مرحلوں میں ان کے لئے کوئی دشواری باقی نہ رہے، اس لئے نہ وہ صرف مطالعہ کا طلبہ میں ذوق پیدا کرنا چاہتے بلکہ ان کے پیش نظر مطالعہ کے طریقے سے بھی طلبہ کو آگاہ کرنا تھا۔ خاص اس مقصد کے لئے ان کے سامنے درس میں کتابوں کا انبار رہتا جس سے ضرورت کے وقت بطور حوالہ اصل مآخذ پر نشاندہی فرماتے تاکہ طلبہ زبانی حوالوں پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ مسائل میں مدلل گفتگو کی انہیں عادت پڑ جائے۔ مولانا منظور نعمانیؒ نے اپنے مقالہ میں ان کی اسی خصوصیت پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

’’درس کے وقت صحاحِ ستہ اور ان کے علاوہ حدیث کی اور کتابیں حضرت کے سامنے رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تو صرف زبانی حوالے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے۔(۱)

جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں اور آپ کے تلامذہ کے متعدد حوالوں سے واضح کیا گیا کہ علامہ کشمیری کا درس صرف حدیث ہی کی شرح وتفسیر تک محدود نہ تھا بلکہ حدیث کے عنوان پر ہمہ جہت افادات جن میں تنوع کے ساتھ جامعیت وگہرائی ہوتی آپ کے درس کا امتیاز تھا، اس کے باوجود جب آپ کسی مسئلہ پر کلام کرتے تو اگرچہ یہ کلام کسی ادنیٰ مناسبت کی بناء پر ہوتا مگر جس جانب بھی طبیعت متوجہ ہوتی اس پر کامل اور سیر حاصل بحث فرماتے۔

……◆……

(۱) غیر معمولی قوت حافظہ اور یادداشت جو ایک موہبتِ الٰہی کی طرح مرحوم کو حاصل تھی اس کا ایک حیرت انگیز منظر روزانہ طلبہ کے سامنے آتا جس کی تفصیل مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے اسی محولہ بالا مضمون میں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ دورانِ تقریر ہاتھ بے تکلف اس کتاب پر جاتا جس کا حوالہ دینا چاہتے اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل ایک خاص انداز میں کہتے ہوئے اس طرح کتاب کھولتے کہ بعض اوقات تو وہی صفحہ کھلتا جس پر وہ حدیث ہوتی ورنہ دو چار ورق اِدھر اُدھر سے الٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے ہوتی تھی۔ جن حضرات نے یہ منظر نہیں دیکھا انہیں آج یہ سن کر غالباً حیرت ہوگی اور شاید بہت سوں کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا، لیکن جن لوگوں کو حضرت کے درس میں چندروز بھی بیٹھنے کا موقع ملا ہوگا انہوں نے تقریباً روزانہ سبق میں یہ عجوبہ دیکھا ہوگا۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاءُ۔

امام محمد بن الحسن الشیبانی

اور اسلامی اقتصادیات

مولانا بدر الحسن القاسمی، کویت

امام اعظم ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانی جن کے بارے میں امام شافعی فرماتے ہیں کہ علم وفضل اور ذکاوت میں میں نے ان کا مثیل نہیں دیکھا انکی گفتگو سن کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قرآن کریم انہیں کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ امام محمد نے صرف فقہ حنفی کی تدوین نہیں کی بلکہ تمام فقہی مذاہب کی تدوین کی راہ کھول دی سب نے پھر انہیں کے طریقہ کو اپنایا۔ امام محمد کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے بین الاقوامی قوانین کی تدوین کی ان کی کتاب السیر الکبیر کو اس سلسلہ میں سبقت حاصل ہے جسکا اعتراف غیر مسلم محققین بھی کرتے ہیں۔

جرمنی میں ''جمعیۃ الشیبانی'' کے نام سے انجمن قائم ہے جو اس بات کے اعتراف کے لئے قائم کی گئی ہے بین الاقوام قوانین کا موجد کوئی انگریز یا جرمن نہیں امام محمد بن الحسن الشیبانی ہیں۔

السیر الکبیر کا ترجمہ ترکی فرنچ اور جرمن زبان میں صدیوں سے موجود ہے اور اس سے وہاں کے قانون دانوں اور دیگر ارباب فکر نے استفادہ کیا ہے۔

امام محمد بن الحسن الشیبانی کا ایک اہم کام اور بڑا کارنامہ ''اسلامی اقتصادیات'' کے فن کی ایجاد اور اسکے اصول وضوابط کی تدوین بھی ہے۔

اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہوں نے ''علم اقتصاد'' کا جو تصور پیش کیا ہے موجودہ زمانہ کے ماہرین اقتصادیات اس پر اب تک کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکے۔

امام محمد کی کتاب ''الکسب'' یا ''الاکتساب بما یحل من الاسباب'' کو اسلامی اقتصادیات کے فن کی ایجاد کی طرف پہلا قدم کہا جا سکتا ہے۔

چنانچہ جامعہ ازھراور جامعہ الامام محمد ابن سعود کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شوقی احمد دنیا نے ''اعلام الاقتصاد الاسلامی'' کے نشریاتی سلسلہ کا آغاز امام محمد بن الحسن الشیبانی سے ہی کیا تھا۔

امام محمد کے نظریات کا حاصل یہ ہے کہ: ''اکتساب''یعنی محنت کر کے روزی کمانا اور اپنی جدوجہد سے وسائل زندگی حاصل کرنے کی کوشش کرنا انسانی زندگی کی ضرورت اور عالم کی بقاء اور تہذیب وتمدن کے فروغ کا وسیلہ ہے۔

امام محمد کا کہنا ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس کے جسم کی بقا کے لئے چار چیزیں: کھانا پینا اور ستر چھپانے۔

سردی وگرمی اور بارش سے بچنے اور رہنے کے لئے مکان بنانا اس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے اور ان ضروریات کے حصول کے اسباب ساری دنیا کے لوگ اپناتے اور اس کے لئے جدوجھد کرتے ہیں۔

امام محمد کا کہنا ہے کہ:"الاکتساب هو طلب تحصيل المال بما يحل من الأسباب"

اسلامی نقطہ نظر سے'' اکتساب مال کے حصول کے لئے جائز اسباب کے اختیار کرنے کا نام ہے۔''

اس تعریف سے ہی اسلامی اور غیر اسلامی اقتصادیات کا فرق واضح ہوجاتا ہے کہ تمام ماہرین اقتصادیات کی نظر ایسے معاملات پر ہوتی ہے جن میں نفع زیادہ ہو۔

لیکن اسلامی اقتصادیات میں صرف وہی طریقے اور معاملے اختیار کئے جاسکتے ہیں جو شرعا جائز اور حلال ہوں حرام اور ناجائز معاملات کی اس میں ہرگز گنجائش نہیں ہے خواہ اس میں کتنا ہی فائدہ کیوں نہ ہو۔

دنیائے دوسرے اقتصادی نظاموں میں نظر طلب کے مطابق پیداوار یا مصنوعات میں اضافہ اور کوالیٹی میں تنوع پر ہوتی ہے ان کو حلال وحرام سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لوگوں کی خواہش پوری کرنے کیلئے جو سامان بھی درکار ہو وہ فراہم کرنا اور زیادہ نفع کمانا ان کا نصب العین ہوتا ہے۔

امام محمد کی ذکر کردہ اس قید نے عمومی اقتصادی سرگرمیوں پر پابندی لگائی ہے کہ مال کے حصول کے لئے صرف وہی اسباب اختیار کیے جاسکتے ہیں جو حال اور مشروع ہوں حرام اور ممنوع نہ ہو ہوں۔

حرام وسائل کے ذریعہ مال کمانا یا تجارت کو فروغ دینا اسلامی اقتصادیات کے منافی ہے۔

شراب خانے کھولنا یا قمار بازی کے اڈے قائم کرنا یا اور دیگر حرام چیزوں کی فراہمی اور تبادلے کے لئے کمپنیاں قائم کرنا جائز نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کے دائرہ کار اور مسلمان ملکوں میں اس طرح کی تجارتی سر گرمیوں پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔

امام محمد کی اس کتاب کا مقصد مال کمانے جمع کرنے اور خرچ کرنے "الاموال فی الاسلام کسبا و ادخارا وانفاقا" کے ایسے قواعد وضوابط کی نشاندہی کرنی ہے جو مسلمانوں کی اقتصادی سرگرمیوں کیلئے راہ عمل کی حیثیت رکھیں۔

امام محمد نیاقتصادی سرگرمیوں یا مال کے حصول کے ذرائع کو چار قسموں میں منحصر قرار دیا ہے:

(1) اجارہ، یعنی مزدوری اور ملازمت کرنا اسی طرح مکان دکان اور سواری کے وسائل وغیرہ کو کرایہ پر لگانا۔

(2) تجارت، خرید وفروخت کے تمام جائز طریقے زمانہ کے بدلنے اور ترقی کرنے کے ساتھ اسکی نئی اور مختلف شکلیں۔

(3) زراعت، قدیم زمانہ سے غلہ یعنی جو گیہوں چاول کے ساتھ سالن کے طور پر استعمال ہونے والی سبزیاں اور پھل فروٹ سب کے حصول کیلئے زراعت یا کاشت ہی سب سے اہم وسیلہ ہے

(4) صناعت، یا انڈسٹری کا شمار بھی حصول مال کے بنیادی اسباب وذرائع میں شمار ہوتا رہا ہے

ذاتی استعمال کی چیزوں سے لیکر جنگی اسلحہ تک کی تیاری کار اور سواری کے دیگر وسائل گھریلو استعمال کے برتن مختلف قسم کی مشینیں سب صناعت کے زمرہ میں کی آتی ہیں

امام محمد نے اب سے بارہ سو سال پہلے کسب مال کے جو ذرائع بتلائے ہیں آج تک اقتصادیات کے ماہرین اس پر کوئی مفید اضافہ نہ کرسکے جس سے امام محمد کی غیر معمولی عبقریت شرعی احکام میں بصیرت اور انسانی زندگی کی ضروریات سے ان کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

کسب معاش کے موضوع پر متعدد علماء نے کتابیں لکھی ہیں لیکن امام محمد کو ان سبھوں پر فوقیت اور سبقت حاصل ہے اور ان کی کتاب سب سے پہلی ہونے کے ساتھ سب سے جامع اور ہر پہلو پر حاوی اور مجتھدانہ خصوصیات کی حامل ہے۔ اور جیسا کہ پہلے میں نے ذکر کیا ڈاکٹر شوقی احمد دنیا جو جامعہ ازھر اور محمد بن سعود یونیورسٹی میں تجارت واقتصاد کے سابق پروفیسر تھے انہوں نے ''اعلام الاقتصاد الاسلامی'' کا سلسلہ شروع کیا تو اس سیریل کا آغاز امام محمد بن الحسن الشیبانی کی شخصیت سے ہی کیا۔

اسی طرح ڈاکٹر حمد الجنیدل نے اپنی کتاب ''مناھج الباحثین فی الاقتصاد الاسلامی'' میں امام محمد بن الحسن اور ان کی کتاب ''الکسب'' یا الاکتساب کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر رفعت العوضی جامعہ ازہر جامعہ ام القری جامعہ قطر کے پروفیسر رہے موسوعہ اقتصاد

اسلامی کے مرتب رہے اور جن کا ابھی دو دن پہلے 13 جولائی کو انتقال ہوا ہے ہے انہوں نے 1403ھ میں قطر سے شائع ہونے والے ''مجلہ الامۃ''میں تفصیلی مضمون لکھا تھا جس میں موجودہ زمانہ کے ماہرین اقتصادیات کے نظریات کی روشنی میں امام محمد کی کتاب کا جائزہ لینے اور ثابت کیا ہے کہ امام محمد کے بیان کردہ اصول موجودہ زمانہ کے نظریات سے نہ صرف ہم آہنگ ہیں بلکہ ان سے فائق ہیں اور ان کی کتاب کو اس موضوع کی پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے،اس لئے کہ سکتے ہیں کہ امام محمد اسلامی اقتصادیات کیفن کے موجد ہیں اور انہوں نے کتاب وسنت کی روشنی میں سب سے پہلے اسکے اصول وضوابط کو مرتب انداز سے پیش کیا ہے.

انہوں نے ایک بلند پایہ فقیہ ومجتہد ہونے کی حیثیت سے اقتصادی سرگرمیوں کے شرعی احکام بھی بیان کئے ہیں اور ان امور کو بھی واضح کیا ہیکہ معاشی سرگرمیں میں آدمی کو کس حد تک لگنا چاہیے جس سے یکسوئی کے ساتھ عبادت میں خلل بھی واقع نہ ہو اور تونگر ہو کر اللہ تعالی کا شکر ادا کرنا افضل ہے یا مسکینی وفاقہ مستی میں رہ کر صبر کا دامن تھامے رہنا بہتر ہے؟

اور سوال کرنا کب جائز ہے اور دینے والا بہتر ہے یا لینے والا

امام محمد کی یہ کتاب پہلے ''الکسب'' کے نام سے شائع ہوئی تھی اور اب

''الاکتساب فی الرزق المستطاب'' کے نام سےتحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے

شمس الائمہ سرخسی کی شرح کے ساتھ ہی کتاب کا نسخہ ملتا ہے۔اصل متن کی تلاش کے لئے ترکی اور یورپ کے مکتبات میں بکھرے ہوئے مخطوطات کے ذخائر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

امام محمد نے اقتصادیات کی یہ کتاب کیوں لکھی؟

امام سرخسی کا بیان ہے کہ:ان الامام محمد صنف هذا الكتاب فى الزهد على ما حكى انه لما فرغ من تصنيف الكتب قيل له :الا صنفت فى الزهد اى الورع شيئا؟ فقال صنفت كتاب البيوع يريد ان المرأ اذا طاب مكسبه حسن عمله ثم أخذ فى تصنيف هذا الكتاب.

یعنی دیگر کتابوں کی تصنیف سے فراغت کے بعد جب ان سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے زھد وتقوی کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے کتاب البیوع اسی لئے لکھی ہے کیوں کہ آدمی کی آمدنی حلال کی ہوگی اور اس کا کھانا پاکیزہ ہوگا تو اس کا عمل بھی صالح ہوگا اور اصل تقوی

یہی ہے۔ بعد میں ان کی صحت سازگار نہیں رہی اور کتاب کی تکمیل نہ کر سکے جو وہ لکھنا چاہتے تھے صرف اس کے خاکے میں ایک ہزار ابواب کی نشاندہی کی گئی تھی۔

ویحکی انه قیل له :فهرس لنا ما کنت ترید ان تصنفه ففهرس له الف باب فی الزهد والورع۔

دراصل امام محمد کو شروع سے تجارتی امور کو جاننے اور پیشہ وروں کے معاملات کو جاننے اور دیکھنے کا خاص اہتمام تھا تاکہ انکے بارے میں شرعی حکم پوری بصیرت کے ساتھ متعین کر سکیں۔

مناقب الکردری میں ہے : محمد بن الحسن یذهب الی الصباغین ویسأل عن معاملاتهم وما یدیرونها فیمابینهم

علامہ زاہد الکوثری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: انظر الی هذا المجتهد العظیم کیف کان لایکتفی بما عنده من علم الکتاب والسنة واقوال الصحابة والتابعین وسائر فقهاء الأمصار وبما له من الفقه فی العلوم العربیة حتی کان فی حاجة الی تعرف وجوه التعامل بین ارباب الصناعات ومعرفة وجوه الفرق بین العرف القدیم والعرف الحدیث الطارء حتی یسلم کلامه من الخطأ فی ای ناحیة من نواحی تبیین احکام الشرع هکذا یکون بذل الجهد واجتهاد الرأ۔(بلوغ الأمانی)

اور حقیقت یہی ہے کہ فقہی مسائل کی تحقیق وتنقیح کرنے والوں اور نئے مسائل کے شرعی احکام کا استخراج واستنباط کی ذمہ داری ادا کرنے والوں کو امام محمد کے اس اسوہ پر عمل کرنا چاہیے تاکہ انکی طرح مختلف پیشہ کے لوگوں سے مل کر اوران کے تعامل کو دیکھ کر مسئلہ کی حقیقت کو صحیح طریقہ پر سمجھ سکیں اور جدید عرف سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد مسئلہ کا حکم بیان کر سکیں اس لئے کہ قاعدہ یہی ہے کہ "الحکم علی الشئ فرع لتصورہ"

……✦……

آخری قسط

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ
اور علوم وفنون میں آپ کی جامعیت

ابوطہ محمد صغیر پرتاپ گڑھی
استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

ذوق شعر وسخن

اللہ رب العزت نے آپ کو شعر وسخن کا بھی عمدہ ذوق عطا فرمایا تھا۔ موزونیت طبع کا یہ عالم تھا کہ طویل سے طویل منظومات فی البدیہہ اور بے ساختہ آپ کی زبان گوہر فشاں سے منظوم ہو جایا کرتی تھیں۔ آپ کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ وافی وکافی اور ذہن رساں تھا، عربی وفارسی کے ہزاروں اشعار از بر تھے، جو موقع محل کی مناسبت سے برجستہ زبان پر آ جاتے تھے۔ آپ کی اسی خصوصیت کو حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی یوں بیان فرماتے ہیں:

> ''آپ کی عادت یہ بھی تھی کہ زبان کے کسی مشکل لفظ کی تشریح کرتے ہوئے یا کسی اور ضرورت سے عربی شعر کو پیش کرنا چاہتے تو گو کہ شہادت کے لئے ایک مصرعہ یا ایک شعر ہی کافی ہوتا ہے، لیکن یادداشت کی بے پناہ قوت کا نتیجہ تھا کہ ایک مصرعہ کے لئے بیس بیس پچیس پچیس، بلکہ اس سے بھی زیادہ اشعار والی نظموں کو مسلسل سنائے چلے جاتے۔ میرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی، جو شاہ صاحب کو زبانی یاد تھے، جنہیں جس وقت جی چاہتا سنا سکتے تھے، فارسی ادب کا مذاق بھی کافی رکھتے تھے، کبھی کبھی درسی تقریروں میں فارسی کے موزوں اشعار ترنم کے خاص لہجہ میں استعمال فرماتے۔ (تصویر انور، ص: ۲۶۴)

مولانا ابراہیم صاحب پروفیسر ڈگری کالج اسلام آباد کشمیر لکھتے ہیں:

> ''ایک اندازہ کے مطابق پندرہ ہزار سے زیادہ اشعار آپ نے موزوں کئے، لیکن دستیاب اتنے نہیں ہیں، اس تعداد سے گیارہ سے پچیس اشعار خالص عربی کے باقی کا تعلق فارسی سے ہے۔'' (ایضاً، ص: ۲۲۷)

اردو میں بھی کچھ منظوم کلام موجود ہے، لیکن بہت معمولی۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب

صاحب آپ کے ذوق شعری کو ان الفاظ میں بیان کرتے تھے:

’’فن ادب اور شاعری کا ذوق بہت بلند پایہ تھا، دارالعلوم میں عام اجتماعات یا کسی بڑی شخصیت کے قدوم یا کسی اہم حادثہ کے وقوع پر قصائد قلمبند فرماتے اور انھیں مجمع میں سناتے، پڑھنے کا طرز نہایت دلکش تھا، ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، جس سے سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا، عربی اور فارسی کی بلاغت اعلیٰ مقام تک پہنچی ہوئی تھی۔ فرماتے تھے کہ مقامات حریری جیسی کتاب ایک گھنٹہ میں چار ورق برجستہ لکھ سکتا ہوں، اردو سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، لیکن کلام بہر حال بلیغ ہوتا تھا، مگر عربیت آمیز‘‘۔ (ایضاً ص:۳۹۱)

مولانا ابراہیم صاحب پروفیسر ڈگری کالج اسلام آباد کشمیر لکھتے ہیں کہ:

’’آپ نے حریری کی مقامات کے تتبع میں اپنی مقامات لکھی تھی، جس میں کچھ مقامات بے نقطہ اور کچھ با نقطہ الفاظ کے تھے۔‘‘ (ایضاً ص:۲۲۶)

حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی رقم طراز ہیں کہ:

’’عربی میں آپ کو ابوالعلاء معری اور فارسی میں خاقانی کا ہمرنگ کہا جاسکتا ہے۔ (تصویر انور ص:۵۵)

فخر المحدثین حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری اپنے ایک مقالہ ’’دانائے راز وفخر روزگار کے مابین مراسم‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’علامہ کی شاعری کو دیکھ کر فضلائے عرب نے عرب جاہلیت کی شاعری کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ (ماہ نامہ محدث عصر، بابت ماہ مئی ۲۰۰۳ء، ص ۲۴)

عربی، فارسی اور اردو کلام کے نمونے ملاحظہ کریں:

عربی کلام

تبارک من اسری و اعلی بعبده ✦ الى المسجد الاقصى الى الافق الاعلى
الى سبع أطباق الى سدرة كذا ✦ الى رفرف ابهى الى نزلة اخرى
الى سبع أطباق الى سدرة كذا ✦ الى رفرف ابهى الى نزلة اخرى
وسوى له من حفلة ملكية ✦ ليشهد من آيات نعمته الكبرى
براق يساوى خطوه مد طرفه ✦ أتيح له واختير فى ذلك المسرى
و ابدى له طىّ الزمان فعاقه ✦ رويدا عن الاحوال حتاه مأجرى
هنا موطن فوق الزمان ثباته ✦ على حالة ليست به غير تترى

(حیات ابن مریم، ص: ۹۳)

فارسی کلام

معراج توکرسی شدہ وسبع سموات ✦ فرش قدمت عرش بریں سدرہ سریری
برفرق جہان پایہ پائے توشدہ ثبت ✦ ہم صدر کبیری وہمہ بدر منیری
ختم رسل و نجم سبل صبح ہدایت ✦ حقاکہ نذیری تو والحق کہ بشیری
آدم بصف محشر و ذریت آدم ✦ در ظل لوایت کہ امامی و امیری
یکتا کہ بود مرکز ہردائرہ یکتا ✦ تا مرکز عالم توئی بے مثل و نظیری
ادراک بخ تم ست وکمال ست بخاتم ✦ عبرت بخواتیم کہ در دور اخیری
امی لقب وماہ عرب مرکزایمان ✦ ہر علم وعمل را تو مداری و مدیری

(ایضاً،ص:۹۶)

اردو کلام

سفر کی منزل ہے دار دنیا، ذرا تو اس کا خیال سا کر
سدا نہیں ہے یہ دیس تیرا، ضرور جانا ہے دن نبھا کر
کبھی تأمل سے داہنے بائیں، آگے پیچھے کو دیکھ لینا
کدھر کو جاتے ہیں دوست پیارے، کہاں وہ رہتے ہیں یاں سے جا کر
وہ چل بسے سارے باری باری، یہ باقی خلقت بھی چل بسے گی
تو چشم عبرت سے دیکھ غافل، کبھی تو اپنی نظر اٹھا کر
چلے ہی جاتے ہیں قافلے سب، یہاں کا ٹھہرا ہوا ہے یہ ڈھپ
کسی کا آنا کسی کا جانا، کبھی ہنسا کر کبھی رلا کر

(الانور،ص:۲۶۳)

کتب سابقہ اور عبرانی وانگریزی زبان

قرآن وحدیث میں مذکیر امم سابقہ کے تاریخی واقعات وحوادث کے پس منظر اور احوال کو جاننے کے لئے آپ نے عبرانی زبان بھی سیکھی اور سابقہ آسمانی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ بھی فرمایا اور بہت سے مسائل کی وضاحت وتشریح میں ان سے کام لیا۔جیسا کہ آپ کے شاگرد حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے امم قدیمہ اور مختلف تاریخی واقعات وحوادث کا ذکر آیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب ان پر سے سرسری نہیں گزرتے تھے، بلکہ اپنی عادت کے مطابق کتب قدیم اور قدیم مآخذ کی روشنی میں، ان میں سے ایک ایک چیز کی تاریخی وجغرافیائی تحقیق کرتے اور اسے بیان فرماتے تھے۔'' (تصویر انور، ص: ۵۳)

الکشمیری خود فرماتے ہیں:

''میں نے عبرانی سیکھی تا کہ اصل مآخذ کا مطالعہ کروں اور تحریف کی حقیقت پر اطلاع ہو۔'' (نوادرات، ص: ۲۳۵)

اسی حوالے سے حضرت مولانا محمد انوری اپنا مشاہدہ یوں بیان فرماتے ہیں:

''مقدمہ بھاولپور میں دوران بحث تورات شریف کی بعض آیات عبرانی الفاظ میں پڑھ کر سنائیں اور اپنے دست مبارک سے لکھ کر جج صاحب کو دیں۔ ایک آیت راقم کو یاد ہے:

"نَابِی مِقْرَبِخْ مِیحیخَ کاموخ یا قیم لَخَ الُومخ الَاوَتِشْماعُون نِبّی من قُربِکَ مِنْ اَخِیْکَ کَاَخِیْکَ یُقِیْمُ لَکَ اِلٰهُکَ اِلَیْهِ تَسْمَعُوْنَ۔'' (تصویر انور، ص: ۴۵۸)

علامہ یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''آپ نے اناجیل اور اسفار عہد عتیق مع ان کی شروحات وغیرہ کا مطالعہ کیا تھا، آپ عبرانی زبان سمجھتے تھے، اور تورات کا اصل عبرانی زبان میں مطالعہ کیا تھا، اس کی بہت سی آیات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت سے متعلق تھیں آپ کو یاد بھی تھیں۔ درس بخاری کے دوران آپ کی زبان مبارک سے میں نے خود یہ دو بشارتیں عبرانی زبان میں آپ سے سنیں تھیں:

"نابی مقربخ مئخیخ کاموخ یأ قیم لخ الوهخ إلاوتشماعون،یهو مسینائی باوظارح مساعیر کوفیعه مهرباران'' (نفحۃ العنبر، ص: ۸۸۔ ملخصاً۔)

علاوہ ازیں آپ کی عظیم تصنیف ''عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسی علیہ السلام'' میں بہت سے مقامات پر اناجیل اربعہ کے حوالے موجود ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اناجیل اربعہ کا بھی مطالعہ انتہائی گہرائی سے فرمایا تھا۔

چنانچہ ایک جگہ آپ لکھتے ہیں:

''عہد متوسط میں اعمال رسل کی تیسری فصل میں اس بات کی صراحت ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل میں نبی بھیجے جانے کا عہد تمام انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا تھا۔'' (حیات ابن مریم، ص: ۸۸)

مزید لکھتے ہیں:

''جب کہ وہ عہد جو: بی بی ہاجرہ سے ہوا اس کی بابت ''کتاب الخلیقہ'' (کتاب پیدائش) میں

ہے کہ: ہاجرہ سے خداوند کے فرشتے نے کہا کہ تو حاملہ ہے اور عنقریب ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا، خدا نے تیرا دکھ سن لیا اور وہ بدوی ہوگا، اس کا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے۔

''کتاب متی و کتاب اشعیاء'' (۲۸-۱۶) اور مزامیر (۱۱۸-۲۲) میں ہے کہ: ''وہ پتھر جسے معماروں نے پھینک دیا، قصر کا آخری کونا ثابت ہوا، یہ سب کچھ خدا نے کیا، اگرچہ تمہیں عجیب لگ رہا ہے۔'' (حیات ابن مریم، ص:۱۰۹)

مشہور صاحب قلم فاروق ارگلی صاحب اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

''انگریزی زبان پر بھی حضرت کو خاصی مہارت حاصل تھی، ایک بار حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا ''ہمارے ساتھیوں میں کسی نے انگریزی بھی پڑھی ہے؟''۔ اس پر مولانا نے عرض کیا: ''میں نے کشمیر میں چھ ماہ انگریزی پڑھی ہے۔'' انگریزی زبان میں آپ ایک گریجویٹ سے کچھ زیادہ ہی استعداد رکھتے تھے، لیکن اس زبان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ (سہ ماہی حسن تدبیر دہلی، علامہ انور شاہ نمبر، ص:۲۲۷)

علم طب

''علم طب بھی شاہ صاحب نے بعد علوم دینیہ، دہلی میں حکیم واصل خاں صاحب کے زمانہ میں پڑھا تھا، اگرچہ مطب نہیں کیا، مگر کتابوں پر پورا عبور تھا۔ نفیسی، شرح اسباب، خارج اوقات میں دیوبند کے زمانہ قیام میں پڑھائی ہیں۔'' (تصویر انور، ص: ۴۷۳)

''ایک بار دیوبند میں شفاء الملک حکیم رضی الدین صاحب تشریف لائے، ان کے اعزاز میں دارالعلوم کی جانب سے ایک استقبالیہ جلسہ ہوا، جس میں آپ نے برجستہ فن طب، بلکہ قدیم و جدید اصولِ علاج پر، دو گھنٹہ تک مفصل تقریر فرمائی، حکیم صاحب اس پُر مغز تقریر کو سن کر بے حد متاثر ہوئے طب کی بیشتر کتابیں اپنے برادر نسبتی حکیم سید محفوظ علی صاحب، مولانا صدیق صاحب نجیب آبادی اور مولانا ادریس صاحب سکھروڈوی کو گھر پڑھائیں۔'' (نقش دوام، ص:۱۱۶)

علم الحیوانات والنباتات

اللہ رب العزت نے آپ کے قلب کو ایسا منور فرمایا تھا اور ایسا غضب کا حافظہ عطا فرمایا تھا کہ جو کچھ پڑھ لیتے، سن لیتے، یا دیکھ لیتے، وہ نقش کالحجر ہو جاتا تھا اور پھر اسے بھولتے نہیں تھے۔ مزید یہ کہ غضب کے اس حافظے کے ساتھ، مطالعہ کا شوق بھی حد سے بڑھا ہوا تھا، ہمہ وقت اسی میں مصروف رہتے، بڑی

بڑی کتابوں کا مطالعہ چند دن میں مکمل فرما لیتے اور پھر جو کچھ مطالعہ فرماتے وہ سب بالکل صحیح طریقہ سے یاد بھی رہتا۔اسی کا کمال تھا کہ ہرعلم وفن کی کتابوں کا آپ نے مطالعہ فرمایا اور کمال حاصل کیا۔جیسا کہ آپ کے شاگرد حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی رقم طراز ہیں:

''حضرت کی طبیعت بے حد متجسس و متفحص اور تحقیق پسند تھی،جس چیز سے واسطہ پڑتا،اس کی حقیقت و ماہیت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ایک مرتبہ کشمیر کے خصی مرغ کا ذکر آ گیا،تو اس کی دسیوں قسمیں اور ان کے خواص بیان کر دیئے،کسی پھل یا کسی حیوان کا ذکر آیا اور اس پر فوراً ایک لکچر دیدیا،معلوم ہوتا تھا کہ ''علم الحیوانات'' اور ''علم النباتات'' جن پر متقدمین عرب کی کافی تصنیفات ہیں،وہ بھی مطالعہ سے گذر چکی ہیں۔(تصویر انور،ص:۵۴)

علم نجوم اور فن رمل و جفر

مطالہ کی وسعت اور ہرعلم وفن سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق اس قدر زیادہ تھا کہ آپ نے علم نجوم اور فن رمل وجفر کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا اور عبور حاصل کیا۔آپ کے شاگرد حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب آپ کے اس کمال کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

''مطالعہ کے سلسلہ میں فن عصریہ،فلسفۂ جدید،حتیٰ کہ فن رمل اور جفر کی کتابوں کو بھی مطالعہ سے نہ چھوڑا۔''(تصویر انور،ص:۳۸۳)

مولانا احمد رضا بجنوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:''دینی علوم متداولہ کے علاوہ فن طب،جفر،رمل و نجوم وغیرہ علوم کا بھی مکمل مطالعہ فرمایا تھا اور ان کی مشکلات پر بحث فرماتے تھے اور سائلین کو تسلی بخش جواب دیتے تھے۔(ملفوظات محدث کشمیری،ص:۴۴)

ایک مرتبہ پنجاب کے ایک صاحب جو پیری مریدی بھی کرتے تھے،علم جفر کی بعض چیزیں دریافت کرنے کی غرض سے ہی پنجاب سے تشریف لے آئے تھے اور دو تین روز قیام کرنے کے بعد اپنا مقصد حاصل کر کے واپس تشریف لے گئے۔''(تصویر انور،ص:۳۷۴)

مولانا کریم بخش صاحب پروفیسر اورینٹیل کالج لاہور کا بیان ہے کہ میں نے رمل و نجوم کی بعض کتابیں حضرت شاہ صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔''(نقش دوام،ص:۱۱۶)

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم وصلی اللہ تعا لی علی رسو لہ العربی والہ واصحا بہ اجمعین

امام کشمیری علیہ الرحمۃ کے ممتاز تلامذہ (سلسلہ:۱۲)

مولانا محمد انوری لائل پوریؒ

مولانا سید فضیل احمد ناصری

استاذ حدیث جامعہ ہذا و نائب مدیر ماہ نامہ محدث عصر، دیو بند

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!

علم وعمل کے مرقع۔ بزرگوں کے شیدا۔ اسلاف کے محب۔ سلاطینِ علم کے تلمیذ رشید۔ بڑے بڑے مشائخ کے دست گرفتہ۔ ختم نبوت کے دیوانے۔ باطل کے لیے تیغ براں۔ قادیانیت کے لیے بلائے بے درماں۔ امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے مثالی شاگرد۔ اس قدر مثالی کہ ان کے نام کو اپنے نام کا جزء لازم بنالیا۔ یہ ہیں تحفظ ختم نبوت کے سرخیل، مرزا قادیانی اور اس کی ذریت کے لیے آفت ناگہاں حضرت مولانا محمد انوری لائل پوری۔ فنافی الاسلام۔ اتباع سنت کے حریص۔ مخدوم العلماء والمشائخ جیسے القاب سے سرفراز۔ خادم ملت بن کر رہے۔ مخدومیت ان کے جلو میں رہی۔ اصل نام محمد تھا۔ مولانا محمد جالندھریؒ کوٹ بادل خان والے حضرت گنگوہی کے اجلہ خلفاء میں سے تھے۔ مولانا کے عقیقے میں وہ بطور خاص آئے تھے۔ انہوں نے ان کا نام اپنے نام پر رکھا۔ علامہ کشمیریؒ کے دامن فیض سے وابستگی کے بعد انوری بھی لگالیا۔

مولانا کی ولادت باسعادت

مولانا کی ولادت بروز ہفتہ 6/صفر 1319ھ مطابق 25/مئی 1901 میں ہوئی۔ ان کا وطن جالندھر کی تحصیل نکودر کا ایک قصبہ ''اوگی بہادر کے'' تھا۔ 1947ء میں ہندوستان سے چلے گئے۔ لائل پور ضلع فیصل آباد کو اپنا وطن بنالیا۔ اس مناسبت سے لائل پوری کہلائے اور یہی نسبت اہل علم میں مشتہر ومتعارف۔

مولانا کے والد اور ان کا مختصر تعارف

مولانا کے والد کا نام فتح الدین، دادا کا نام پیر بخش اور پردادا کا نام محکم تھا۔ مولانا کے والد بھی بڑے عالم اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ بعضوں نے انہیں دارالعلوم دیوبند کا فاضل بھی لکھا ہے۔ شیخ الہندؒ سے

خاصی عقیدت رکھتے۔ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد اور خادم خاص تھے۔ ان سے بیعت وارشاد کا تعلق بھی تھا۔ حیات انوری میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

''مولانا نے ابتدائی کتب کا درس مولانا بدرالدین سے لیا اور تکمیل حضرت مولانا محمد فاروقی کوٹوی سے کی۔ آپ مذاہب ائمۂ اربعہ پر ناقدانہ وسیع نظر رکھتے تھے۔ بڑی بڑی ضخیم کتب فقہ: فتاویٰ شامی، عالمگیری، البحر الرائق وغیرہ کا متعدد بار مطالعہ فرمایا۔ مبسوط کتب تفسیر مثل تفسیر کبیر وغیرہ ازبر تھی۔ مسائل علم کلام اور جزئیات فقہیہ مع ان کے ادلہ کے محفوظ تھے۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی۔ ان مدارس کی مدت العمر مالی خدمت فرماتے رہے۔ تمام عمر احیائے سنت اور اہانت شرک وبدعت میں گزار دی۔ 1303ھ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے اور منازل سلوک طے کرتے رہے۔ حضرت گنگوہیؒ سے سلسلہ مراسلت جاری رہتا تھا۔ حضرت گنگوہی کے وصال کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن کی طرف رجوع کیا۔ دارالعلوم دیوبند کے 1328ھ جلسۂ دستار بندی کے موقع پر شیخ الہندؒ کی خصوصی دعوت پر شریک ہوئے۔'' (صفحہ نمبر 4645)

مولانا کے والد بڑے رئیس اور زمین دار تھے۔ پیشے سے نمبر دار۔ اوگی بہادر کے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کی نمبرداری ان سے ہی متعلق تھی۔ وہ آرائیں برادری کے فردِ فرید تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ برادری ملک شام سے ہندوستان آئی تھی۔ جھنڈے کو عربی میں الرایۃ کہتے ہیں۔ آرائیں اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

تعلیمی مراحل، تربیتی اسفار

ابھی تین چار سال کے ہی ہوئے تھے کہ بسم اللہ کے گنبد میں داخلہ لیا۔ پانچ برس کی چھوٹی سی عمر میں حکیم محمد عمر جالندھری سے ناظرہ خوانی مکمل کی۔ چھٹی جماعت میں پہونچے تو والد صاحب نے فارسی شروع کرادی۔ بوستان سعدی سمیت متعدد کتابیں گھر میں ہی پڑھیں۔ پھر دریائے ستلج کے کنارے مدرسہ رائے پور گوجراں لے جایا گیا۔ اس ادارے کے بانیوں میں والد گرامی مولانا فتح الدین صاحبؒ بھی شامل تھے۔ حافظ محمد صالح خلیفۂ حضرت گنگوہیؒ اس کے سرپرست تھے۔ وہاں کے نمایاں مدرسین میں مفتی فقیر اللہ رائپوریؒ اور مولانا فضل احمد رائپوریؒ تھے۔ ہم رنگ، آہنگ بھی خانقاہی مزاج کے حامل۔ ان کی بزرگانہ ادائیں دامن دل کھینچتیں۔ قیام وطعام حافظ محمد صالح صاحب کے گھر رہا۔ پھر مفتی فقیر اللہ صاحبؒ کے گھر اس کا انتظام ہوگیا۔ خورد ونوش کی فیس والد محترم ماہ بہ ماہ بھیج دیا کرتے۔

خرابیٔ صحت اور تعلیمی فترت

سبک خرام تعلیمی سفر اچانک رک گیا۔ مولانا کی طبیعت خراب ہوگئی اور ایسی ہوئی کہ دو سال تک لگا تار گہوارۂ علوم و آگہی سے دور ہو گئے۔ تیسرے سال پھر مدرسے میں داخل ہوئے۔ پچھلی کتابیں دہرائیں اور اگلے اسباق پڑھے۔ سکندر نامہ، یوسف زلیخا، جامع قواعد، احسن القواعد، نیرنگ عشق، نفحۃ الیمن، قلیوبی، سبعہ معلقات اور مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحبؒ سے پڑھیں۔ میزان، منشعب، ابواب الصرف، صرف میر، نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایۃ النحو، ایساغوجی، میزان منطق، مرقات، تہذیب، منیۃ المصلی، کافیہ اور قدوری حضرت مولانا فضل احمد رائے پوریؒ سے پڑھیں۔

گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کا سفر

سالانہ امتحان کے موقع پر بہ حیثیت ممتحن مولانا کریم بخش لدھیانویؒ کو مدعو کیا گیا۔ یہ مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی کے صدر المدرسین تھے۔ ہر فن مولا۔ علم ہیئت اور ریاضی کے تو مسلم امام تھے۔ تیس سال اس ادارے کی صدارت تدریس کو رونق بخشی۔ مولانا انوری صاحبؒ کا انہوں نے امتحان لیا۔ ان کی حاضر جوابی، تیاری اور استعداد سے کریم بخش صاحب تاڑ گئے کہ یہ ہونہار قطرہ موتی بن کر چمکے گا۔ انہیں گوجراں سے نکال اپنے ادارہ مدرسہ عربیہ منبع العلوم گلاؤٹھی ضلع بلند شہر لے گئے۔ مدرسے میں ان کا داخلہ کرایا، یہ دانش گاہ اس زمانے میں اشاعتِ اسلام کا ایک بڑا مرکز سمجھی جاتی تھی۔ وہیں مولانا نے کنز الدقائق، شرح تہذیب، مقامات حریری اور شرح جامی کے کچھ حصے پڑھے۔

گلاؤٹھی سے پھر گوجراں کو واپسی

گلاؤٹھی کی آب و ہوا مولانا کو راس نہیں آئی۔ وہاں ایک سال گزارا ہی تھا کہ طبیعت پھر ناساز ہوگئی اور ناچار انہیں اپنے پرانے ادارے کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہاں آ کر ان تمام کتابوں کی تکمیل کی، جو گلاؤٹھی میں رہ گئی تھیں۔ ان کتب سے فراغت کے بعد مشکوٰۃ شریف کا درس لیا۔

عصری تعلیم بھی جاری رہی

اس دوران انہوں نے عصری تعلیم بھی پائی۔ اورینٹل کالج لاہور سے مولوی فاضل، منشی فاضل اور ادیب عالم کے امتحانات دیے اور اعلیٰ پوزیشن سے کامیابی حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند کا سفر

دارالعلوم کی خدمات کا شہرہ پورے عالم میں پھیل چکا تھا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہ اللہ شیخ الکل اور استاذ العلماء کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ مالٹا کی جیل کئی سال کاٹنے کے بعد ان کی رہائی عمل میں آئی اور دیوبند سے واپسی ہوئی تو ملک کے قدآور علما ان کی زیارت کو اُمڈ پڑے۔ مولانا انوری کے والد مولانا فتح الدین صاحب نے بھی اسی مقصد سے سفر کیا اور اپنے فرزند کے ساتھ دیوبند چل پڑے۔ شیخ الہند کی مجلس کس قدر باوقار اور پر شکوہ ہوتی تھی، اس کا نقشہ خود مولانا محمد انوری کے قلم سے دیکھیے:

> ''ہائے افسوس کہ وہ بھی مجلسیں تھیں کہ جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مالٹا سے تشریف لائے تو بعد عصر سہ دری کے پاس صحن میں چارپائی بچھائی جاتی تھی۔ اس پر گائے کا سالم چمڑا بچھایا جاتا تھا۔ اس پر حضرت شیخ الہند تشریف فرما ہوتے تھے، اور چارپائی کے ارد گرد کرسیاں بچھائی جاتی تھیں، جن پر حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا عزیز الرحمن دیوبندیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا تاج محمود امروٹی سندھیؒ اور خود حضرت مولانا محمد انور شاہ تشریف فرما ہوتے تھے۔ پھر کوئی کہنے والا یہ کہتا تھا کہ حضرت مہتمم صاحبان تشریف لا رہے ہیں: یعنی حضرت مولانا محمد احمد اور حضرت مولانا حبیب الرحمنؒ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ پھر آواز آتی کہ حضرت مولانا کفایت اللہ دہلویؒ بھی تشریف لائے ہیں اور حضرت مولانا عاشق الٰہیؒ بھی میرٹھ سے تشریف لائے ہیں۔ ان سب کے لیے بھی کرسیاں بچھائی جاتی تھیں اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ برابر خدمت میں کھڑے رہتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کے ارد گرد علما و صلحا کا مجمع اتنا کثیر رہتا تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی اور خود اپنا مقدمۃ القران سنایا کرتے تھے اور لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے۔'' (انوار انوری جدید صفحہ نمبر 15)

دارالعلوم میں داخلہ

دیوبند پہونچے اور یہاں کی آب و ہوا دیکھی تو ان کا دامن دل کھنچ گیا۔ شیخ الہند رحمہ اللہ 1333ھ میں ہی دارالعلوم کی تدریس چھوڑ چکے تھے، تاہم اس سال انہوں نے بہ طورِ تبرک علم کی گہرافشانی کا ارادہ کر لیا تھا۔ 1338ھ میں مولانا نے داخلہ لیا۔ شیخ الہند نے بخاری شریف کے چند ہی اسباق پڑھائے تھے کہ

ضعف ونقاہت نے ان کی تدریس چلنے نہیں دی۔ بقیہ حدیثیں حسب سابق امام العصر علامہ کشمیریؒ نے پڑھائیں۔ رجب 1339ھ مطابق 1921ء میں فراغت پائی۔ سالانہ امتحان میں اعلیٰ نمبرات حاصل کیے۔ ایک نظر ذیل کی فہرست پر بھی ڈال لیں:

نمبر شمار	کتب امتحان	حاصل کردہ نمبرات	نمبر شمار	کتب امتحان	حاصل کردہ نمبرات
1	مؤطاامام مالک	50	7	ترمذی شریف	47
2	مؤطاامام محمد	50	8	مسلم شریف	45
3	شمائل ترمذی	50	9	ابوداؤد شریف	45
4	سراجی	50	10	بیضاوی شریف	45
5	ابن ماجہ	49	11	نسائی شریف	43
6	طحاوی شریف	48	12	بخاری شریف	40

علامہ کشمیریؒ کی پہلی زیارت

امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی پہلی زیارت شیخ الہند کے در دولت پر ہوئی۔ اس کی شان اور کیفیت کیا تھی؟ فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری قدس سرہ کے قلم سے سنیے:

”دارالعلوم دیوبند اپنے والد مرحوم کے ہمراہ تعلیم کے لیے حاضر ہوئے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر فوراً حاضری دی۔ گرمی کا زمانہ، دوپہر کا وقت، حضرت مرحوم کے اردگرد معتقدین کا ہجوم، جن میں ایک صاحب حضرت شیخ الہند کو دستی پنکھا جھل رہے تھے اور حضرت کے آرام وراحت کے خیال سے بڑھتے ہوئے ہجوم سے بہ آواز نرم کہتے: بھائی ذرا دور رہیے! حضرت کو تکلیف ہوگی۔ یہ پنکھا کرنے والے دارالعلوم دیوبند کے صدر رئیس العلماء حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہ تھے۔ بقول حضرت مولانا انوری لائل پوری: حضرت شاہ صاحب کی یہ سب سے پہلی زیارت تھی، اور معصومیت کی گھڑی گڑھائی تصویر پہلے ہی لمحے میں مولانا انوری کے قلب مشتاق میں جا گزیں ہوگئی۔“ (لالہ وگل جدید، ص:09209)

ان کی سند پر جن اساتذہ کے دستخط ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا حافظ احمد نانوتویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ اور مولانا اعزاز علی امروہویؒ۔

تدریسی خدمات

فراغت کے بعد لدھیانہ کے مدرسہ عزیزیہ میں مدرس ہو گئے اور طویل عرصے تک وہاں تدریسی ذمے داریاں سنبھالیں۔ حیات انوری میں لکھا ہے:

> ''دیوبند سے فراغت کے بعد آپ واپس تشریف لائے اور لدھیانہ کے مشہور علمی مرکز مدرسہ عزیزیہ میں تدریس شروع فرمائی اور عرصۂ دراز تک اسی مدرسہ سے منسلک رہے۔ پھر رائے کوٹ کے مسلمانوں کے بے حد اصرار پر رائے کوٹ چلے گئے اور وہاں مدرسہ تعلیم الاسلام قائم کیا۔ اس مدرسے کے لیے آپ نے کئی کنال جگہ خریدی۔ مدرسہ تعلیم الاسلام میں ناظرہ اور حفظ قرآن کے علاوہ کتب بھی پڑھائی جاتی تھیں۔'' حیات انوری،79,78)

ہجرت کے بعد لائل پور گئے تو وہاں انہوں نے ایک مدرسہ بنام تعلیم الاسلام قائم کیا۔ اس ادارے میں شروع سے ہی دورۂ حدیث تک کی تعلیم رکھی۔ مرحوم دورے کی کتابیں بھی بڑے اہتمام سے پڑھاتے رہے۔ 1966ء تک تسلسل کے ساتھ حدیث کے اسباق جاری رہے۔ کامیاب مدرس کے طور پر ان کی شہرت رہی۔ درس قرآن کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا تو وہ بھی کافی مقبول رہا۔ دور دراز سے لوگ اس میں شرکت کے لیے آتے اور دروس سے استفادہ کرتے۔

ہندوستان سے ہجرت

تحریک آزادیٔ ہند کا سفینہ ساحل پر لگنے کو تھا۔ ملک کے سیاسی حالات مدوجزر سے گزر رہے تھے۔ 1947 میں تو یہ حال ہوا کہ پورا پنجاب مسلمانوں کے لیے آتش کدۂ فارس بن گیا۔ اہل اسلام چن چن کر مارے جا رہے تھے۔ خانماں بربادی ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ مولانا کا گھرانہ بھی زد میں آیا۔ انہیں گھر بار چھوڑ کر کیمپ میں گزارنا پڑا۔ پھر چند دنوں کے بعد مع اہل خانہ پاکستان ہجرت کر لی۔ فیصل آباد پہنچے، مدرسہ تعلیم الاسلام قائم کیا اور درسی و انتظامی مصروفیات سے امت کو فیض یاب کیا۔ فیصل آباد میں مدارس اور مساجد کا جال بچھانا ان کی بڑی ترجیح رہی۔

علامہ کشمیریؒ سے والہانہ عقیدت اور نسبت انوری

علامہ کشمیریؒ کی ساحرانہ شخصیت انہیں کچھ ایسی دل کو بھائی کہ ان کے اسم گرامی کو اپنے نام کا ایک حصہ

ہی بنا لیا اور اسی نسبت سے مشہور ہوئے۔ اتنا ہی نہیں، جو بھی نیا کام ان کے دم سے جاری ہوا تو اسے بھی کشمیری قدس سرہ سے ہی معنون فرمایا۔ حیات انوری میں لکھا ہے:

''آپ پر انوری نسبت غالب آ گئی تھی، چنانچہ رائے کوٹ ضلع لدھیانہ میں مدرسہ تعلیم الاسلام قائم فرمایا تو مسجد کا نام مسجد انوری رکھا۔ قیام پاکستان کے موقع پر جب ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تو لائل پور (حالیہ فیصل آباد) کو اپنا مسکن بنایا۔ وسط شہر کے محلہ سنت پورہ میں مسجد بنائی تو اس کا نام بھی مسجد انوری رکھا۔ جھنگ شہر میں حضرت صوفی شیخ محمد صاحب خلیفہ ومجاز حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری نے مدرسہ قائم کیا تو اس کا نام آپ نے انوارالاسلام رکھوایا۔ غلام محمد آباد میں مدرسہ انوار الاسلام اور مسجد انوری تعمیر کروائی۔ متعدد مدارس انوار القران اور انوار الاسلام کے نام سے شہر و ضلع فیصل آباد میں تعمیر کروائے۔ احقر مؤلف کے نانا جان میاں غلام مصطفی جالندھری جب کانگنا نزد ملسیاں ضلع جالندھر سے ہجرت کر کے فیصل آباد آئے تو حضرت مولانا محمد انوری سے والہانہ تعلق قائم ہو گیا۔ جب حضرت نانا جی نے چک نمبر 213 سوساں روڈ میں مسجد بنوائی تو حضرت انوری نے اس کی انجمن کا نام انوارالاسلام رکھا، جو آج بھی اسی نام سے موسوم ہے اور جس کے زیر نگرانی مدرسہ انوار الاسلام اور جامع مسجد عثمان غنی قائم ہے۔ الحمدللہ جڑانوالہ میں بھی ایک مسجد انوری اور مدرسہ انوارالقران موجود ہے۔'' (ص:60/61)

فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری قدس سرہ نے بھی علامہ کشمیری پر ان کی فدائیت کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خانوادۂ انوری سے تعلق اور قلبی روابط کا یہ عالم تھا کہ برادر اکبر نے جب دیوبند سے انور نامی ہفتہ وار جریدہ شائع کیا تو مرحوم اس کے سب سے بڑے معاون تھے اور خاکسار کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ نقش حضرت مرحوم کے الطاف وعنایات سے تین سال تک شائع ہوتا رہا اور خود خریدار بہم پہونچاتے۔ پاکستان سے ترسیل رقم کے ذرائع مہیا کرتے۔ والدہ مرحومہ کے لیے حج کا انتظام فرمایا اور خاکسار کے رہائشی مکان کی تعمیر میں مدد فرمائی۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور پاکستان منتقل ہو گئے اور مدرسہ انوریہ کا افتتاح کیا۔ 1964 میں یہ ظلم وجہول ایک ہفتے کے قریب لائل پور میں ان کا مہمان رہا۔ اعلی میزبانی وضیافت کے ساتھ کل پاکستان میں مسافرت کے اخراجات مرحوم ہی نے ادا کیے۔ کھانے پر بیٹھتے تو شروع سے آخر تک اپنے استاد کا ذکر فرماتے، خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے۔'' (نقش دوام صفحہ نمبر 61)

مولانا انوری علامہ کشمیری کی نظر میں

مولانا محمد انوری جہاں شاہ صاحب پر فدا تھے، وہیں امام العصر بھی ان پر کرم گستری کرتے۔ وہ اپنے فقید المثال استاذ کے معتمد ہو چکے تھے۔ ان کی نوازش ونوال کا ذکر خود مولانا نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ غالباً 1348ھ بیروں کا موسم تھا اور دیوبند حاضر ہوا۔ حضرت شاہ صاحب بھی ڈابھیل سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت صحن میں چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ مولانا مشیت اللہ بجنوری اور بہت سے مہمان بیٹھے تھے۔ کمال مہربانی فرمائی۔ ہمیں دیکھتے ہی چارپائی سے اٹھ کر ننگے ہی پاؤں ہماری طرف تشریف لائے اور مصافحہ فرمایا۔ پھر مولانا مشیت اللہ بجنوری کے پاس تشریف فرما ہوئے اور ان کو بیر کا چھلکا اتار کر عنایت فرما رہے تھے۔ ایک طبق ہماری طرف بھی رکھ دیا اور ایک طالب علم کو فرمایا کہ ان کو چھیل کر کھلاؤ اور دوسرے طالب علم کو جیب مبارک سے ایک روپیہ نکال کر دیا اور فرمایا کہ بکری کا عمدہ گوشت بازار سے لاؤ! پھر گھر کے اندر تشریف لے گئے۔

مولوی محفوظ علی فرماتے تھے کہ گھر میں حضرت فرما رہے تھے کہ بہت معزز مہمان آئے ہیں، کھانا عمدہ پکائیو! پھر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ دوٹوکرے باقر خانیوں کے لے آئے! اتنی تکلیف کیوں اٹھائی؟ اگر کوئی شے لانا ہی ہو تو یسیر سی چیز لے آیا کرو! میرے ہاں محبت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت تھوڑی چیز لانا چاہیے۔ پھر فرمایا: آپ ذرا لیٹ جایئے! یہ کمبل ہیں، ان کو نیچے بچھا لیجیے! خود اپنے دست مبارک سے عنایت فرمائے۔ ہم نے متبرک سمجھ کر تکیے کے نیچے رکھ لیے۔ پھر دوپہر کو کھانا پر تکلف بھیجا۔ مولانا محفوظ علی اور مولانا محمد ادریس سکروڈھوی بھی اور کئی ایک مہمانوں نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر بعد ظہر میں نے عرض کیا کہ ساتھی کو بیعت فرما لیں! نہایت شفقت سے قبول فرما لیا اور دوازدہ تسبیح چشتیہ کا ذکر تلقین فرمایا۔

جب شام کی گاڑی سے ہم واپس ہونے لگے تو فرمانے لگے کہ اگر کوئی اور گنجائش ہو تو اور ٹھہر جاؤ! آخر میں عرض کیا: کل کو رخصت لے لیں گے۔ پھر اگلے دن صبح کو مجلس ہوئی۔ جب رخصت ہونے لگے تو فرمایا کہ آپ کی مہمانی کا تفقد نہیں ہو سکا۔ کچھ خیال نہ کرنا! میں بھی علیل ہوں۔ مجھے بہت رقت ہوئی کہ اتنی شفقت پر بھی یہ عذر!!'' (انوار انوری جدید، صفحہ نمبر 89,88,87)

مقدمہ بہاولپور میں علامہ کشمیریؒ کی علمی معاونت

یہ تو حسن سلوک اور مہمان نوازی کی بات تھی۔مولانا انوری شاہ صاحب کے علمی معاونت بھی بنائے گئے۔علامہ کشمیری کے یہاں ان کا یہ مقام ان کی پختہ استعداد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔فتنۂ قادیانیت کے استیصال میں علامہ کشمیری کے کارنامے سے دنیا واقف ہے اوراس کی مفصل روداد منظر عام پر آچکی ہے۔مقدمۂ بہاولپور میں علامہ کشمیری نے اسلام اور عالم اسلام کی جس شان سے ترجمانی کی،تاریخ کو اس پر ناز رہے گا۔برہان سے بھرپور اپنی تقریروں سے قادیانیت کے تاروپود بکھیر دیئے۔یہ تاریخی واقعہ 1932ء میں پیش آیا۔مقدمے کی یہ کارروائی 19 / دنوں تک چلتی رہی۔مولانا انوری اس قضیے میں علامہ کے دست راست تھے۔امام ہمام نے انہیں اپنا معاون خصوصی بنایا تھا۔مسلمان لڑکی کا وکیل بھی انہیں ہی نامزد کیا تھا۔وہ خود فرماتے ہیں:

> ’’بہاولپور کے تاریخی مقدمہ میں شہادت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانبدار ہوکر جب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تشریف لے گئے۔احقر حضرت کے ہمراہ تھا۔مولانا اسعد اللہ سہارنپوری اوراحقر دونوں کو حضرت شاہ صاحب نے مختار مقدمہ بنوایا،چنان چہ احقر کو 19 / یوم سعادت رفاقت نصیب ہوئی۔‘‘(حیات انوری،ص:80)

مولانا کے ذمے جو اور کام تھے،ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ علامہ کشمیری کو فوراً حوالے فراہم کریں۔جج کے سامنے امام کشمیری کی تقریر چلتی تو مولانا مرحوم متعلقہ کتاب اٹھاتے اور حوالے نکال کر علامہ کو دیتے۔یہ ان کی علمی حذاقت اور فنی مہارت کی غمازی کرتا ہے۔

تحریک ختم نبوت میں شمولیت اور قید و بند کی صعوبتیں

قادیانیت کے خلاف تحریک زوروں پر تھی۔1953 میں اس مہم نے شدت اختیار کر لی۔مولانا مرحوم ان دنوں مشرقی پاکستان میں تھے۔تحریک کے قائدین میں مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری بھی تھے۔انہوں نے خط لکھ انہیں بلالیا اوراپنے معاون کے طور پر تحریک میں شامل کرلیا۔رائپوری مرحوم جہاں نہ پہونچ پاتے،اپنی جگہ پر مولانا انوری کو بھیج دیتے۔مولانا کی شمولیت سے تحریک مزید توانا ہوئی۔انہیں دنوں مولانا کو گرفتار کرلیا گیا اور چھ مہینے کی قید بامشقت ہوئی۔جیل میں انہیں تنہا رکھا گیا۔داروگیر ہوئی تو مولانا کے دل کی کیفیت اس وقت کیا تھی؟انہیں کی زبانی سنیے:

''جب انہوں نے مجھے ہتھکڑی لگائی تو میں نے اللہ کو مخاطب کر کے یہ کہا: آج تک مجھے کبھی بھی ہتھکڑی نہیں لگی۔ تیرے پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کی خاطر آج مجھے ہتھکڑی لگائی جا رہی ہے۔ اور آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کی وجہ سے مجھ پر رقت طاری ہوئی۔ میں نے کہا: یا اللہ تو میری اس نسبت کو قبول فرما لے! میں تیرے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر جیل جا رہا ہوں، چنانچہ جیل بھیج دیا گیا اور اپ پر کیس چلا۔'' (حیات انوری، ص86)

جیل گئے تو پہلی ہی رات اس طرح گزری کہ خواب میں حضور علیہ السلام کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک ان کے کندھے پر تھا۔ چھ مہینے کے بعد انہیں رہائی نصیب ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند کا مولانا پر اعتماد

مولانا کو دارالعلوم سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اگرچہ تقسیم ہند کے بعد دیوبند کا سفر زیادہ نہ کر سکے، مگر اس سے جذباتی لگاؤ آخیر سانس تک قائم رہا۔ دارالعلوم کی خدمات کو وہ اپنے لیے سعادت سمجھتے اور اس کی ترقی کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ پاکستان سے چندے کی رقم انہیں کی وساطت سے آتی تھی۔ حیات انوری میں لکھا ہے:

''رسالہ دارالعلوم پاکستان میں جاری کروایا اور رسالہ نقش کے سب سے بڑے خریدار بھی خود تھے۔ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے سفیر رہے۔ جملہ چندہ آپ ہی کی وساطت سے دارالعلوم جاتا تھا۔ مدرسہ کی رسید بک آپ کے پاس رہتی تھی۔ 1967ء تک ماہ نامہ دارالعلوم کے سرورق کے اندرونی طرف ناظم چندہ ورسالہ کے لیے آپ کا نام گرامی درج رہا۔

جب 53،1952 میں دیوبند کے دارالعلوم کو مالی بحران کا سامنا ہوا تو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی کے خطوط لے کر مولانا عبدالرحمن صاحب لائل پور (فیصل آباد) مولانا محمد انوری کے پاس آئے۔ چناں چہ اس وقت سب سے زیادہ چندہ آپ کی وساطت سے ہوا اور دیوبند بھیج دیا گیا۔ وہ رقم آج کے حساب سے تقریباً دس کروڑ بنتی ہے۔ اس پر دارالعلوم کے ارباب اہتمام نے فیصلہ کیا کہ آئندہ پاکستان سے جو چندہ بھی آئے، وہ مولانا محمد انوری کی معرفت آئے گا۔'' (حیات انوری، ص، 90)

تصنیفات و تالیفات

مولانا کی شخصیت تحریکی اور خانقاہی ہونے کے ساتھ قرطاس وقلم میں بھی سرگرم تھی۔ ایک درجن سے زیادہ کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، جن میں سیرت خاتم الانبیاء، اربعین من احادیث النبی الامین، فضائل مکہ مکرمہ، السنن الآثار لسید الابرار، البشارات فی حل الاشارات، الحج المقبول، مسئلۂ حیات النبی، تقلید کیا ہے؟ بڑی اہم ہیں۔ علامہ کشمیری ان کے استاذ بھی تھے اور مرشد بھی، اس لیے کچھ کتابیں ان سے منسوب بھی نکلیں۔ نطق الانور: یہ علامہ کشمیری کی تقریر ترمذی ہے۔ حیات انور: یہ اپنے استاذ کی سوانح حیات تھی، جو ترک وطن کے دوران پنجاب میں رہ گئی۔ انوار انوری: یہ کتاب کافی مشہور ہے۔ اس میں علامہ کشمیریؒ کے حالات و کمالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ علامۃ الہمام کی معرکۃ الآرا کتاب خاتم النبیین کا اردو ترجمہ بھی لکھا۔ تدریس وتحریک کے ساتھ اتنی اہم کتابوں کا لکھنا لاریب ایک کرامت ہے۔

بیعت وسلوک اور خانقاہی سرگرمیاں

مولانا نے عربی تعلیم کا آغاز جن اساتذہ کی ماتحتی میں کیا تھا اور جس ادارے میں تعلیمی سفر ان کا شروع ہوا تھا وہ مکمل خانقاہی تھا۔ لامحالہ اس کا اثر مولانا پر بھی پڑا۔ بچپن سے ہی ان کی طبیعت تعلیم کے ساتھ سلوک کی طرف بھی چل پڑی۔ ان کی پہلی وابستگی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے دامن پر انوار سے ہوئی۔ ان کے بعد امام العصر علامہ کشمیری سے۔ جب ان کی بھی رحلت ہوئی تو شاہ عبدالقادر رائے پوری کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ ان کی خوش نصیبی کہ تینوں جگہوں سے انہیں خلافت ملی۔ اتنی بڑی بڑی شخصیات سے خلافت کا مل جانا تاریخ دیوبندیت کے نوادرات میں سے ہے۔ یہ تینوں اپنے زمانے کے انتہائی خدارسیدہ، صوفی ومرتاض اور رفیع المنازل مشائخ تھے۔ اس سے مولانا کی روحانیت، اللہ سے بے پناہ لگاؤ اور حضور علیہ السلام سے شدید محبت آشکارا ہوتی ہے۔ شیخ الہند رحمہ اللہ سے کس طرح وابستہ ہوئے، اس کی داستان سناتے ہوئے انوار انوری میں لکھا ہے:

''آپ کے استاد محترم مفتی فقیر اللہ نے حضرت شیخ الہند سے درخواست کی کہ اسے بیعت فرمالیں۔ حضرت نے فوراً قبول فرما کر بیعت کرلیا۔ آپ حضرت شیخ الہند کی خدمت میں شب و روز رہنے لگے۔ رائے پور گجراں میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اجلہ خلفا سے کسب علم وفیض کر چکے تھے، جس کی برکت سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی سعادت مندی کو محسوس فرماتے ہوئے آپ کو خلافت سے نواز

دیا، چنانچہ حضرت انوری اپنے مریدین کو حضرت شیخ الہند کے سلسلے میں بھی بیعت فرماتے تھے۔آپ کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ ہماری مسجد کے مؤذن صوفی محمد زکریا نے مجھے یہ بات بتائی کہ جب حضرت انوری نے مجھے بیعت کیا تو آخر میں یہ الفاظ کہلائے:

بیعت کی میں نے حضرت شیخ الہند سے محمد کے ہاتھ پر۔''(حیات انوری،ص:54,53)

تصوف کی راہ سے بھی مولانا نے زریں خدمات انجام دیں اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔جن علما و مشائخ نے ان سے خلافت پائی، ان میں مشہور محقق عالم مولانا عبدالرشید نعمانی بھی شامل ہیں۔فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری قدس سرہ بھی ان کے خلفا میں سے تھے۔

مولانا کی وفات

مولانا کی زندگی خیر و خوبی کے ساتھ گزر رہی تھی کہ اچانک ان کا کاروان زندگی مشکلات سے دوچار ہوا۔1962 میں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ مہینوں متاثر رہے پھر 1965 میں دوبارہ یہ حملہ ہوا جس میں ان کی طبیعت مزید متاثر اور نقاہت زدہ ہوگئی۔فالج کے حملے سے پریشان تو تھے ہی، اب دوسرے عوارض بھی ان پر حملہ آور ہوئے۔جنوری 1970 میں پے در پے تین بار دل کا دورہ پڑا۔پہلی بار 9/جنوری کو، پھر 13/کو،اس کے بعد 16/کو۔ہر دورے میں ان کی طبیعت نڈھال ہوتی چلی گئی۔20/جنوری کو مغرب کی نماز سے پہلے آب زمزم پیا اور یہ جملے کہے:

''الحمدللہ زمزم پی لیا۔اندر سیراب ہوگیا۔روح پرواز کرگئی۔''

مغرب کی نماز پڑھی۔تیسری رکعت میں تھے کہ ان پر معمولی سی غشی طاری ہوگئی۔ہاتھ آسمان کی جانب بار بار اٹھاتے۔طبیعت گرتی چلی گئی۔21/کو ڈسٹرکٹ ہسپتال لائل پور کے جایا گیا۔علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔22/ویں جنوری کو فجر کی نماز سے متصل روح ملا اعلیٰ کو پرواز کرگئی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کی خبر نے کہرام مچادیا۔غسل و تکفین کے بعد میت اقبال پارک (دھوبی گھاٹ) جائی گئی۔جنازے کی نماز میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد شریک ہوئے۔نماز ان کے صاحب زادے مولانا عزیز الرحمن انوری نے ادا کرائی اور لائل پور کے بڑے قبرستان میں آسودۂ خواب ہوئے۔

صاحب زادگان میں مولانا عزیز الرحمن انوری، مولانا مسعود الرحمن انوری، مولانا ایوب الرحمن انوری، مولانا عبدالرحمن، مولانا مقبول الرحمن انوری، مولانا سعید الرحمن انوری تھے۔سب کے سب عالم و فاضل اور اپنے عہد کے مانے ہوئے علما۔ایک صاحب زادے مرحوم حبیب الرحمن بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔تین صاحب زادیاں تھیں۔دس اولاد میں سے اب کوئی بھی حیات نہیں۔

......✦......

جامعہ کی سرگرمیاں

ادارہ

شش ماہی تعطیل کا اختتام اور طلبہ کی حاضری

امتحان اپنے مقررہ وقت پر شروع ہوا اور تکمیل کو پہونچا۔ اس کے بعد ششماہی تعطیل ہوئی۔ چھٹی ہوتے ہی طلبہ اپنے اپنے مقامات کو روانہ ہو گئے۔ دفتر تعلیمات سے جاری شدہ اعلامیے کے مطابق 12 / سے 24 /ستمبر تک تعطیل جاری رہی اور 25 / ویں تاریخ کو آخری پرچے کا امتحان ہوا، جو حسب روایت تعطیل کے اختتام پر ہوتا ہے۔ تمام طلبہ بروقت آ گئے اور انہوں نے آخری پرچے میں بھی بڑے اہتمام سے شرکت کی۔

تعطیل کے بعد تعلیم کا آغاز

آخری پرچے کا امتحان جمعرات کو تھا اور سنیچر سے تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ طلبہ درس گاہ میں حاضر ہونے لگے۔ اساتذہ بھی تشریف لا چکے تھے۔ ان کی تدریسی سرگرمیاں بھی اس کے ساتھ ہی جاری ہو گئیں اور درس گاہوں کی رونقیں حسب سابق بحال ہو گئیں۔

ششماہی امتحان کے نتائج آویزاں

ششماہی امتحان کے نتائج آویزاں کر دیے گئے ہیں۔ طلبہ نے الحمدللہ امتحان کی تیاری بڑے جوش و خروش کے ساتھ کی تھی، جس کا منہ بولتا ثبوت ان کے حاصل کردہ نتائج ہیں۔ ہر جماعت کے پوزیشن یافتہ طلبہ کے نام درج ذیل ہیں:

درجۂ ناظرہ : عبدالرزاق سہارنپور، اوّل پوزیشن۔ محمد ارقم ناظری جھارکھنڈ، اوّل پوزیشن۔ طالب سہارنپور، دوم پوزیشن۔ فرمان سہارنپور، سوم پوزیشن۔

درجۂ حفظ : عبدالخالق سہارنپور، اوّل پوزیشن۔ محمد ایوب سمستی پور، دوم پوزیشن۔ سفیان راہی گوتم بدھ نگر، دوم پوزیشن۔ مکابیر سہارنپور، سوم پوزیشن۔

اعدادیہ: محمد کیف دہلی، اوّل پوزیشن۔ سید عمر فاروق سہارنپور، دوم پوزیشن۔ محمد رُمان پورنیہ، سوم پوزیشن

سالِ اوّل: محمد سعد پرتاپ گڑھ، اوّل پوزیشن۔ محمد سہارنپور، دوم پوزیشن۔ سید طٰہٰ لکھنؤ، سوم پوزیشن۔

سالِ دوم: محمد ارشد بھاگلپور، اوّل پوزیشن۔ محمد خالد سہارنپور، دوم پوزیشن۔ فیضان احمد کبیرنگر، سوم پوزیشن۔

سالِ سوم: رئیس احمد ڈار کشمیر، اوّل پوزیشن۔ عبداللہ شیخ سیتامڑھی، دوم پوزیشن۔ محمد سلمان بٹ جھارکھنڈ، سوم پوزیشن۔

سالِ چھارم: مشرف حسین سنت کبیرنگر، اوّل پوزیشن۔ شرف القدوس آگرہ، دوم پوزیشن۔ عبدالرحمن مہاراشٹر، سوم پوزیشن۔

سالِ پنجم: عادل خان مدھیہ پردیش، اوّل پوزیشن۔ محمد نوید ہریانہ، دوم پوزیشن۔ حسان سہارنپور، سوم پوزیشن۔

دورۂ حدیث شریف: زکریا گجرات، اوّل پوزیشن۔ تاج الدین نیپال، دوم پوزیشن۔ ابوذر راجستھان، سوم پوزیشن۔

تکمیل ادب عربی: محمد آصف پرتاپ گڑھ، اوّل پوزیشن۔ حمید حسن شاملی، دوم پوزیشن۔ محمد افنان ہریانہ، سوم پوزیشن۔

تکمیل افتاء: منصور احمد کشمیر، اوّل پوزیشن۔ محمد مزمل کشمیر، دوم پوزیشن۔ سرفراز احمد اعظم گڑھ، سوم پوزیشن۔

محدث عصر کا اگلا شمارہ امام العصر نمبر ہوگا

قارئین محدث عصر کے لیے ایک خوشخبری یہ ہے کہ آپ کے محبوب رسالے کا اگلا شمارہ امام العصر نمبر ہوگا، جوان شاء اللہ کئی سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ماہ دسمبر کے وسط میں دار العلوم وقف دیوبند میں امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے حالات و واقعات، ان کی علمی عبقریت، انفرادیت، ان کی رفعت شان، ان کے تاریخ ساز و عہد آفریں کارناموں کو اجاگر کرنے اور نئی نسل کو ان کارناموں سے روشناس کرانے کے لیے دو روزہ سیمینار کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ اس زریں موقع کی مناسبت سے جامعہ نے بھی رسالہ محدث عصر کے خصوصی شمارہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے، جس کی تیاری بفضلہٖ تعالیٰ چل رہی ہے۔ ملک کے ممتاز اہل علم کے مقالات سے یہ شمارہ مزین ہوگا، لہٰذا اعلان کیا جاتا ہے کہ محدث کا اگلا شمارہ نومبر دسمبر پر مشتمل ہوگا۔

……✦……

نقد و نظر

مبصر: سید فضیل احمد ناصری

نام کتاب: کچھ یادرہا، کچھ بھول گیا	مصنف: مولانا عبدالعلی فاروقی
صفحات: 248۔ قیمت:-/300	اشاعت اول: مئی 2025ء

انسان کو اپنے حالات و واقعات کی معلومات زیادہ ہوتی ہیں۔ اپنی خلوت وجلوت، مختلف احوال و ادوار میں پیش آمدہ حکایات و تاثرات کو وہ زیادہ بہتر طریقے سے یاد رکھتا ہے۔ ان واقعات میں کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو لوحِ دل پر نقش کالحجر ہو جاتے ہیں۔ وقت کی پیہم پامالیاں بھی انہیں دھندلا نہیں کرسکتیں۔ ان واردات میں کچھ ایسے دل چسپ اور نمکین ہوتے ہیں کہ انہیں پیش کرتے ہوئے خود بھی مسرت ہوتی ہے اور سننے والا بھی خوب محظوظ ہوتا ہے۔ بعضوں نے تو اپنے کاروانِ زندگی کی تمام بیش قیمت یادوں کو سوانح حیات کی شکل بھی دے دی، جو بے حد مقبول ہوئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی کو کون بھول سکتا ہے! شیخ الحدیث مولا محمد زکریا کاندھلوی کی آپ بیتی کی لذت کا کیا پوچھنا! مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کاروانِ زندگی تو کئی جلدوں میں سما سکی۔ ان جیسے متعدد اہل علم ہیں جنھوں نے اپنے قافلۂ حیات کو ماضی کی دھندلکوں کی خوراک نہیں بنایا، بلکہ اوراق کے سینے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ یہ یادیں لکھنے والے کے لیے بھی سامانِ فرحت ہیں اور دوسروں کے لیے بھی نشانِ عبرت۔

پیش نظر کتاب: ''کچھ یادرہا کچھ بھول گیا'' قافلۂ حیات ہی کی تھوڑی سی رونمائی ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ سفر نامۂ زندگی تو نہیں، تاہم زندگی کے نشیب و فراز، خوش نما، چشم کشا، انقلاب آفریں، مستقبل ساز اور شخصیت کی تعمیر کرنے والی باتیں اس میں فراوانی کے ساتھ جمع ہیں۔ کتاب کے مصنف ہیں مولانا عبدالعلی فاروقی صاحب۔ سخن فہم، سخن شناس۔ اس سے بڑھ کر سخن ور۔ دنیائے قلم کا ایک بڑا اور معتبر نام، بلکہ عصر رواں کے سلطان القلم۔ ان کا خامۂ عنبر شمامہ عطر بیزیوں اور مشک افشانیوں میں ایک مقام بنا چکا ہے۔ ماہ نامہ البدر کاکوری ان کی صحافتی زندگی کا ایک حسین استعارہ ہے۔ متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکلیں اور دھوم

مچا گئیں۔ان کا اشہب قلم اس طرح سرپٹ دوڑتا ہے کہ کہ بجلیاں اور آندھیاں پیچھے رہ جاتی ہیں اور وہ دم زدن میں منزل آشنا ہوجاتا ہے۔

میں نے یہ کتاب پڑھی اور پڑھتا چلا گیا۔کتاب اس قدر دل چسپ ،مزیدار اور دل آویز ہے کہ جب تک اس کی آخری سطر تک پہونچا نہ جائے ، چھوڑتی ہی نہیں۔خوب صورت تعبیرات ، دل کش اسلوب، دل فریب بندشیں،نکتہ سنجیاں،نتیجہ خیزیاں اس کتاب کی جان ہیں۔پھر جو کچھ لکھا گیا ہے بہت ہی واقعیت اور امانت ودیانت کے ساتھ۔یہ جانتے ہوئے کہ یہ تاریخ کا حصہ ہوگا اور ان کی زندگی کو سمجھنے میں یہ کتاب بھی مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔اس سے پہلے اسی طرح کی کتاب ''یادوں کے جھروکوں سے'' ان کے کلکِ پُر بہار سے نکل چکی ہے، جو اپنی چٹخارے دار زبان اور جاذب ورعنا بیان کی وجہ سے خاصی مقبول ہوئی۔اس کتاب میں مولانا نے اپنے شوخ وشنگ بچپن، اٹھلاتی جوانی اور مشاہدات سے بھرپور بڑھاپے کے اہم واقعات کو بڑے سلیقے سے پرویا،جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نسل نو کی تعمیر وتربیت میں ان واقعات سے کیسے کام لیا جاسکتا ہے۔اپنے طالب علمانہ شب وروز،اس دورانیے کی آزادروی،اس عہد کے لا ابالی پن کو بھی انہوں نے یاد کیا ہے۔مولانا سلامت اللہ صاحب کا تذکرہ جس زبردست سیاق میں کیا ہے اور جس البیلے انداز میں انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے مجھ جیسے طالب علموں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے ان کے علاوہ مولانا فخر الدین مرادآبادی،مولانا وحید الزماں کیرانوی اور دارالعلوم دیوبند کے دیگر اساتذہ بھی زیبِ داستان بنائے گئے ہیں۔دارالعلوم سے فراغت کے بعد عصری تعلیم کس طرح حاصل کی؟ مسٹری لائن سے مولویانہ پٹری پر ان کی گاڑی کیسے چلی؟ یہاں پہونچے تو آنکھیں خوں نابہ بار ہوجاتی ہیں۔اپنے محسنوں کے ساتھ عزیزوں اور قرابت داروں پر بھی ان کا قلم چلا ہے اور اسی کشش وفنی مہارت کے ساتھ۔عنوانات بڑے اچھوتے اور دلوں کو چھونے والے ہیں۔پوری کتاب پڑھنے، بلکہ چاٹنے سے تعلق رکھتی ہے۔

کتاب کے شروع میں مولانا محمد زکریا سنبھلی صاحب کی پر لطف تقریظ بھی ہے اور احمد ابراہیم علوی کی ذائقہ بخش تحریر بھی۔لکھنوی زبان کا ذائقہ لینا ہو،اردو کی چاشنی سے شادکامی مطلوب ہے، ریختہ کے رواں استاذ سے آپ ملنا چاہتے ہیں تو یہ کتاب آپ کی لذت کام ودہن کے لیے چشم براہ ہے۔ادارہ محدث عصر مصنف کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

……◆……

زبانِ خلق

برادرمکرم حضرت مولانا سید فضیل صاحب زید مجدکم ودام اقبالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مسلسل چار مہینوں سے آپ کے ارسال کردہ ماہنامہ محدث عصر کے شمارے پابندی سے پڑھ رہا ہوں۔

عصریات میں ملک و بین الاقوامی سیاسی اور سماجی حالات پر جاندار تبصرے پڑھنے کو مل رہے ہیں، بہت خوب۔

علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کی تابناک زندگی کے مخفی گوشوں کی نقاب کشائی بھی ہورہی ہے۔ حضرت کشمیری کے مایہ ناز تلامذہ کے حالات کا سلسلہ بھی نظر نواز ہورہا ہے، جو گیارہویں قسط کو پہنچ چکا ہے، یہ آپ کا قلمی شاہکار ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ محدث عصر اور اس کے اراکین کو مقبولیت سے نوازے۔ ذرہ نوازی پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

عطاء الحق سلہٹی

ناظم تعلیمات، جامعہ قاسم العلوم

درگاہ شاہ جلالؒ، سلہٹ، بنگلہ دیش

Monthly MUHADDIS-E-ASR Deoband
RNI UPURD/2000/10663(83220)
Contact Mob:+91-9557051315 jimask98@gmail.com
Printed, Published & Edited By Syed Ahmad Khizar Shah
on Behalf of JIMAS, Behind Eidgah, Deoband. Saharanpur (U.P.)
Printed At Mukhtar Press Samreen Printers, Deoband



جامعہ کی مرکزی عمارت ''انور ہال'' اور مسجد انور شاہ پر مشتمل شاندار منظر



جامعہ میں زیر تعمیر جدید دار الاقامہ کا مجوزہ نقشہ



دار الاقامہ کا بیرونی منظر



مسجد انور شاہ

Jamia Imam Mohammad Anwar Shah
A/C No.: 50100420638245
IFSC : HDFC0001974
BRANCH: HDFC DEOBAND